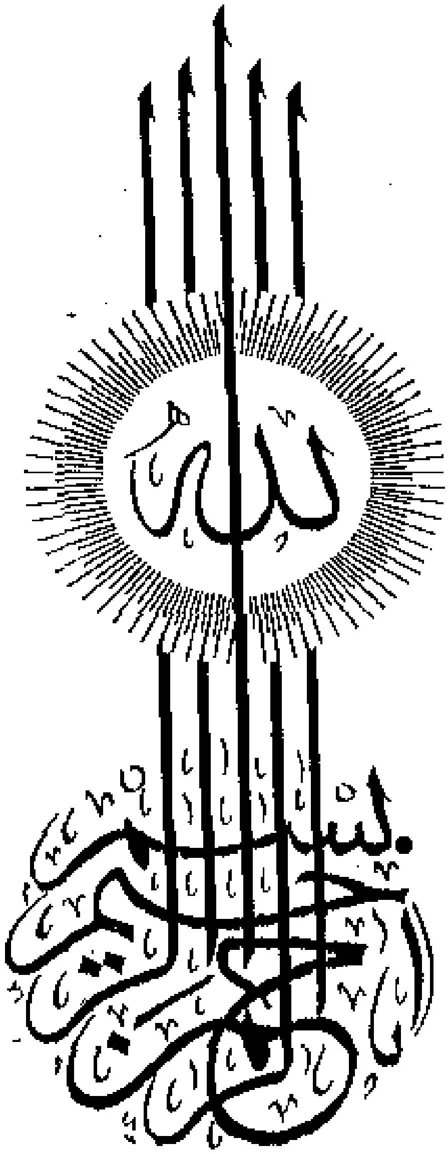
الله
بسم الله الرحمن الرحيم

آپ بیتی کا فن اور "جہان دانش"

ALLAMA IQBAL
Open University Library
(ACQUISITION SECTION)
Acc. No. 27792
Date 12-10-99

مقالہ برائے

ایم فل اردو
1997

مقالہ نگار
ملیحہ وزیر حسین
ہیڈ مسٹریس
سدو والہ اونچا گرلز ہائی سکول نارووال

نگران مقالہ
ڈاکٹر عبید اللہ خان
پروفیسر شعبہ اردو
اورینٹل کالج لاہور

تاریخ: 95-12-2

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد

حوالہ نمبر: F-1-4/95-AR(AC)

فہرست

1۔ باب اول ۔

آپ بیتی کا فن اور روایت ۔ ص ۔ 1 تا 41

2۔ باب دوئم ۔

اردو میں آپ بیتی کی روایت ۔ ص ۔ 42 تا 81

3۔ باب سوئم ۔

احسان دانش سوانحی خاکہ اور تصانیف ۔ ص ۔ 82 تا 102

4۔ باب چہارم ۔

"جہان دانش" کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ ۔ ص ۔ 103 تا 138

5۔ باب پنجم ۔

"جہان دانش کا فنی مطالعہ ۔ ص ۔ 139 تا 171

6۔ باب ششم ۔

معاصر آپ بیتیوں میں جہان دانش کا مقام ۔ ص ۔ 172 تا 248

کتابیات ۔ ص ۔ 249 تا 252

دیباچہ

ایم - اے کرنے کے بعد ایم فل کرنے کا شوق ہوا - بہت دن انتظار کرنے کے بعد اخبار میں ایم فل اردو کے داخلے کا اشتہار پڑھا اور بہت ساری نیک خواہشات کے ساتھ داخلہ کے لیے Apply کر دیا - جس کے جواب میں طویل عرصے کی خاموشی کے بعد داخلہ ٹیسٹ اور انٹرویو کی Call ملی - خیر خدا خدا کر کے یہ مرحلہ بھی گزرا اور پھر علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کی طرف سے اطلاع ملی کہ آپ فلاں تاریخ تک داخلہ جمع کروا دیں -

اس ساری بھاگ دوڑ میں بخوبی یہ اندازہ ہوا کہ اوپن یونیورسٹی اتنی بھی اوپن نہیں ہے کہ کسی بھی دروازے سے داخل ہو جاؤ - بلکہ اس میں داخل ہونے کے لیے وہ تمام مرحلے طے کرنا پڑتے جس کو میرٹ کہتے ہیں -

ایم - فل کرنے کا مرحلہ ایسے طے ہوا کہ دیگر مصروفیات میں سے وقت کی کانٹ چھانٹ کر کے خود کو ہر روز یہ باور کرانا پڑتا تھا کہ ہماری ایک حیثیت طالب علم کی بھی ہے - جس کو وقت پر امتحانی مشق ممتحن تک پہنچانی ہے ورنہ ------------ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کا طریقہ تدریس

بہت بہترین ہے اس میں تشنگان علم کو ان لوگوں سے بھی استفادہ کرنے کا موقع مل جاتا ہے جو علاقے کی دوری کی وجہ سے ہماری دسترس سے باہر ہوتے ہیں ۔ یوں مجموعی طور پر تمام اساتذہ نے بے حد محبت سے ہماری رہنمائی کی لیکن سیکھنے کے اس عمل میں جناب ڈاکٹر مرزا حامد بیگ اور جناب ڈاکٹر آغا سہیل نے بہت زیادہ توجہ سے ہماری بہت سی تعلیمی الجھنوں کو سلجھایا ۔ جس کے لیے میں ان کی بہت ممنون ہوں ۔ امتحانی مشقوں اور امتحانات کے بعد مقالہ لکھنے کا مرحلہ آیا ۔ اور میں نے اپنے مقالے کے لیے "آپ بیتی کا فن اور جہان دانش کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ" کا عنوان منتخب کیا ۔ جس کی منظوری علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے شعبہ اردو کی طرف سے بذریعہ ڈاک موصول ہوئی ۔

اب میں اس مقالے کا مختصر تعارف کرواتی ہوں تاکہ قارئین کو اس کی تفہیم میں آسانی ہو ۔

باب اول ۔ "آپ بیتی کا فن اور روایت"

اس باب میں آپ بیتی کی تعریف آپ بیتی کی اقسام اور دیگر صورتیں بیان کی گئی ہیں ۔ اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بتایا گیا ہے کہ آپ بیتی لکھنے والے کی شخصیت میں کونسے اوصاف ہونے چاہیئے

باب دوم ۔ "اردو میں آپ بیتی کی روایت"

اس باب میں مغرب میں آپ بیتی کی روایت کو مختصراً بیان کیا

ہے ۔ اور اس کے ساتھ ساتھ آپ بیتی کی تین حیثیتیں (1) تاریخی حیثیت ۔ (2) اخلاقی حیثیت ۔ (3) یادگاری حیثیت، بیان کی گئی ہیں ۔ اس باب میں اردو ادب میں آپ بیتی کی تاریخ پر روشنی ڈالی گئی ہے ، اردو ادب میں آپ بیتی کو 1857ء کے بعد رواج ملا اور اردو ادب میں آپ بیتی دیگر بہت سی اصناف ادب کی طرح فارسی سے آئی ہے ۔

باب سوم ۔ "احسان دانش " سوانحی خاکہ اور تصانیف "

اس باب میں احسان دانش کا مختصر سوانحی خاکہ اور دیگر تصانیف کو بیان کیا گیا ہے ۔ اور اس کے ساتھ ہی ناقدانہ آرا ءدرج کی گئی ہیں ۔

باب چہارم ۔ "جہان دانش کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ "

اس باب میں " جہان دانش " کا تعارف کروایا گیا ہے ۔ اور " جہان دانش کا مندرجات اور مشمولات کے لحاظ سے تحقیقی و تنقیدی جائزہ اس طرح لیا گیا ہے کہ احسان دانش کی زندگی اور تجربے کا خاکہ کھنچ گیا ہے ۔

باب پنجم ۔ "جہان دانش کا فنی مطالعہ "

اس باب میں جہان دانش کو آپ بیتی کے اصولوں پر پرکھا گیا ہے کہ یہ کس حد تک اس پر پوری اترتی ہے ۔ اس کی زبان و بیان اور اسلوب کیسا ہے، کتنے صفحات ہیں ، واقعات کی ترتیب کیسی ہے ۔ اور اس میں انہوں نے اپنی زندگی کے واقعات عمر کے کس حصے تک درج کیے ہیں

اسکے علاوہ اس باب میں ایک مختصر گفتگو موضوعاتی حوالے سے بھی رقم ہے۔

باب ششم ۔ "معاصر آپ بیتیوں میں جہان دانش کا مقام"

اس باب میں ان کے عہد کی دو نمائندہ آپ بیتیوں "یادوں کی برات" اور "مٹی کا دیا" کے ساتھ "جہان دانش" کا تقابل کیا گیا ہے ۔ اور دیکھا گیا ہے کہ "جہان دانش" ان سے کس حد تک اور کیوں بہتر ہے ۔

یوں تو مقالہ لکھنا دشوار امر ہے لیکن کسی مخصوص کتاب پر کام کرنا اس سے بھی دشوار کام ہے ۔کیونکہ اگر کتاب کا مصنف زندہ ہو تو بہت سی الجھنوں کو سلجھانے میں ان سے مدد مانگی جا سکتی ہے ۔ لیکن یہاں معاملہ دوسرا تھا ۔ لیکن اس سلسلے میں میرے مقالے کے نگران ڈاکٹر عبیداللہ خان صاحب ڈاکٹر سہیل احمد خان صاحب اور ڈاکٹر فخرالحق نوری صاحب نے میری بھر پور رہنمائی کی ڈاکٹر عبیداللہ خان صاحب نے اپنے قیمتی وقت میں میری وقت بے وقت مداخلت کو برداشت کیا اور میری غلطیوں کی نشاندہی کی جس سے یہ مقالہ نگاری کا سفر آسانی سے طے ہو گیا ۔ میں ان تمام اساتذہ کی بے حد ممنون ہوں ۔ جن کی محبت میرے لیے سرمایہ حیات ہے ۔

اب آخر میں میں اپنے والدین بہن بھائیوں کا شکریہ ادا کرتی ہوں جنھوں نے اس سارے عرصے میں میری کوتاہیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے مجھے اپنے شوق کی تکمیل میں   دیا ۔ ان کے ساتھ ساتھ میں اپنے شوہر واجد رضا کی ممنون ہوں ۔ جنھوں نے میرے اس تعلیمی سفر میں ہر

طرح سے میرا ساتھ دیا ، سارے مقالے کی پروف ریڈنگ کی اور اپنے قیمتی وقت کو میری اس تخلیق کی تکمیل پر خرچ کیا - اور میرے لیے اس کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کو ممکن بنایا -

ملیحہ واجد

رول نمبر 7575089

سٹریٹ حاجی عمر بخش

گندم منڈی - وزیر آباد

باب اول

آپ بیتی کا فن اور روایت

صدا

باب اول

"آپ بیتی کا فن اور روایت"

اپنی ساخت کے اعتبار سے " آپ بیتی " آپ اور بیتی دو الفاظ کی ترکیب سے تشکیل پایا ہے ۔ معنوی اعتبار سے اس میں روداد زندگی کا بیان شامل ہے ۔ زندہ رہنے کے عمل میں انسان کو روز و شب جن حالات و واقعات سے دوچار ہونا پڑتا ہے ۔ ان کی ترتیب کو آپ بیتی سمجھا جا سکتا ہے ۔ زندگی کے چند منتخب لمحات کو جس طرح ہم تصویروں کے ذریعے محفوظ کرنے لگتے ہیں ۔ لفظوں کے وسیلے سے ان لمحات کو بیان کرنا " آپ بیتی " کہلاتا ہے ۔

" آپ بیتی " اس صنف نثر کو کہتے ہیں ۔ جس میں لکھنے والا اپنی زندگی کے حالات یعنی پیدائش سے لے کر آپ بیتی لکھنے والے وقت تک کے حالات و واقعات تسلسل اور تفصیل کے ساتھ بیان کرتا ہے ۔ یہ بالکل ایک ذاتی اور شخصی تخلیق ہے ۔ عموماً عظیم لوگ ، لیڈر اور مشہور لوگ اپنی داستان حیات مرتب کرتے ہیں ۔ تاکہ لوگ ان کی تعلیم و تربیت ، پرورش ، جملہ معاشرتی ، تہذیبی سماجی ، اخلاقی اقدار سے آشنا ہو سکیں ۔ اور جس زاویہ نظر سے انہوں نے زندگی کو دیکھا ہے اس سے پڑھنے والے بھی واقف ہو جائیں ۔ آپ بیتی لکھنے کا صحیح انداز یہ ہے کہ مصنف اپنی خوبیوں کے ساتھ ساتھ اپنی خامیوں اور نقائص سے بھی لوگوں کو آگاہ کرے ۔ گویا آپ بیتی سے مراد کسی شخص کی خود نوشت سوانح عمری ہوتی ہے ۔

آپ بیتی اور سوانح عمری میں فرق یہ ہے کہ آپ بیتی لکھنے والا خود اپنے قلم سے اپنی زندگی کے واقعات و حالات لکھتا ہے - سوانح عمری میں مصنف کسی اور شخص کے حالات زندگی تحریر کرتا ہے - لیکن انسان جس طرح اپنی زندگی کے بعض ڈھکے چھپے گوشوں سے خود واقف ہوتا ہے کوئی دوسرا واقف نہیں ہو پاتا - پھر جس طرح وہ اپنے مصائب اور مشکلات کا خود احساس رکھتا ہے کسی دوسرے شخص کو نہیں ہوتا - اپنی زندگی کے نشیب و فراز کو پورے طور سے آدمی خود ذاتی تجربے کے ساتھ بیان کر سکتا ہے مگر دوسرے آدمی کی زندگی کے نشیب و فراز کو واقعہ کے طور پر سنا سکنے پر قادر ہے -

ہر شخص کی داستان حیات دوسرے شخص سے مختلف ہوتی ہے - آپ بیتی کسی انسان کی زندگی کے تجربات ، مشاہدات ، تجربات ، محسوسات ، نظریات اور عقائد کی ایک مربوط داستان ہے - مصنف اپنے انہی تجربات کو بغیر کسی رد و بدل کے تحریر کرتا ہے اور قارئین اس تحریر سے اس کی زندگی کے چھپے ہوئے گوشوں سے آشنا ہوتے ہیں - تحریر میں جہاں دوسروں کے لئے دلچسپی کا سامان ہے وہاں اس میں عبرت کے نقوش بھی ابھرتے ہیں - ہر شخص اپنی زندگی کے حالات سے دوسرے لوگوں کی نسبت زیادہ آگاہ ہوتا ہے اور جب وہ قلم اس نیت سے سنبھالتا ہے کہ اس نے اپنی گذری ہوئی زندگی کو سپرد قلم کرنا ہے - تب آپ بیتی وجود میں آتی ہے -

خود نوشت سوانح عمری میں مصنف اپنی زندگی کے واقعات کو بیان کرتا چلا جاتا ہے - اس پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ جو شخص آپ بیتی لکھے گا ممکن ہے کہ وہ

اپنی زندگی کے صرف وہی واقعات سامنے لائے جن پر وہ فخر کر سکتا ہو ۔ لیکن وہ واقعات جو اس کے مصائب پر روشنی ڈالتے ہوں انہیں وہ جان بوجھ کر چھپا جائے گا ۔ جو شخص اس طرح کا طرز تحریر اختیار کرے گا وہ اپنی آپ بیتی کے ساتھ انصاف نہیں کر پائے گا ۔

جب اس کی آپ بیتی سامنے آئے گی تو قارئین کو اس حقیقت کا بھی پتہ چل جائے گا کہ اس شخص میں جھوٹ بولنے کا مادہ کس حد تک موجود ہے ۔ آپ بیتی مصنف کے بیان ، قول ، تحریر ، اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے محاسن و مصائب پر بھی روشنی ڈالتی ہے ۔ یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ اپنی خوبیوں کا تذکرہ سینہ ٹھونک کر کرتا ہے جبکہ اپنی کمزوریوں کی پردہ پوشی کرتا ہے ۔ ممکن ہے کہ اس شخص کو یہ خطرہ لاحق ہو کہ اگر قارئین میرے عیوب سے آشنا ہوں گے تو میں اس مرتبے کو کھو دوں گا ۔ جب کہ اپنے عیوب کی پردہ پوشی کر کے میں دوسروں کی نظر میں زیادہ معتبر ہو جاؤں گا ۔ ایسی سوچ رکھنے والا اپنی آپ بیتی کے ساتھ کبھی انصاف نہیں کر سکتا ۔

آپ بیتی محض ایک شخص کی آپ بیتی نہیں ہوتی بلکہ اس شخص کے عہد کے حالات ، اہم واقعات ، کی ایک مختصر تاریخ ہوتی ہے ۔ آپ بیتی کی تاریخ کے ڈانڈے تخلیق آدم سے جا ملتے ہیں ۔ گویا جتنا انسان قدیم ہے اتنی ہی آپ بیتی کی تاریخ قدیم ہے ۔ دنیا کی مختلف زبانوں میں مختلف لوگوں نے اپنی زندگی کے واقعات کو ضبط تحریر کیا ہے ۔

انسانی زندگی میں بے شمار ایسے حادثات پیش آتے ہیں جو انسانی ذہن

پر اپنے ان مٹ نقوش چھوڑ جانے کے ساتھ ساتھ اجتماعی زندگی پر اپنے اثرات بھی مرتب کرتے ہیں ۔ یہ اثرات فرد کو معاشرہ سے اور معاشرہ کو افراد سے مربوط رکھنے کا بھی وسیلہ ہیں ۔ گو یہ تجربات کسی ایک شخص کی زندگی کا حصہ ہوتے ہیں لیکن یہ کٹھن راہوں پر دوسروں کی رہنمائی بھی کرتے ہیں ۔ دنیا میں ہر خاص اور عام شخص اپنی آپ بیتی لکھ سکتا ہے ۔ لیکن کوئی بھی شخص اپنی ساری زندگی کے حالات و واقعات کا احاطہ چند صفحات میں نہیں کر سکتا ۔ کیونکہ اگر وہ اپنی زندگی کے تمام واقعات کو قلمبند کرنا چاہے تو آپ بیتی بے حد ضخیم ہو جائے گی ۔ زندگی میں پیش آنے والے حالات و واقعات کو نوعیت کے اعتبار سے منتخب کیا جاتا ہے ۔ اور اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ احوال زندگی کو پیش کرتے وقت تسلسل بھی قائم رہے ۔ آپ بیتی لکھنے والا ان واقعات کو منتخب کرتا ہے جو لکھنے والے کو متاثر کرنے کے ساتھ ساتھ دوسروں کے لئے بھی مفید ثابت ہوں ۔ کیونکہ آپ بیتی لکھنے کا ایک مقصد ان واقعات کو تحریر کرنا ہے ۔ جن کے ذریعے مصنف کے ذاتی کردار اور افکار کو سمجھنے میں مدد ملے اور اس کی شخصیت ابھر کر دوسروں کے سامنے آ جائے ۔

Autobiography is literally a man's recording of his own life Autobiographical documents can be found in all cultures and all ages, but autobiography as a deliberate literary product is brought into existence only under certain conditions while both ancient greece and rome produced outstanding examples of biography, even the finest examples of classical " auto biography "
(*If it can* be called such) lack the introspection and

self-dissection that characterize the best examples of the form xenophon's Anabasis contains a few elements of auto biography " 1

" Auto biography is literally a man's recording of his own life ---- Autobiography has been provoked by a variety of motives. It may be confessional in which the motive is unburden one's self of a feeling of guilt apologetic, in which the writer attempts to declare and to justify the course of his life or a particular action there of Exploratory. When he uses the act of writting as an instruments of research and probing into his own hither to un-examined behavioral patterns; or simply egocent ric portraiture, when the writer assumes that his life is worth sharing other." 2

عبد المجید قریشی صاحب نے آپ بیتی کی تعریف اس طرح کی ہے ۔

" خود نوشت سوانح حیات وہ کتاب ہے جس کے اوراق میں انسانی حیات مستعار کے مختلف ادوار کو بلا کسی تکلف اور تصنع کے دوسروں کے سامنے پیش کرتا ہے کہ اس نے کن حالات میں اس جہان رنگ و بو میں آنکھیں کھولیں ۔ کس طرح وہ طفل شیر خوار سے لڑکپن کی منزل میں داخل ہوا ۔ اس کا زمانہ طالب علمی کیسے بسر ہوا ۔ عروس شباب نے کیونکر اسے خوش آمدید کہا ۔ زندگی میں کامرانیوں اور کامیابیوں نے

---

1 The Encyclopaedia American - Volume 2 Ankra to Azusa page. 803.

2 Encyclopedia Amarican.

کیسے اس کا خیر مقدم کیا - ان کے ساتھ تلخیاں ، محرومیاں اور ناکامیاں کیسے اس کی راہ میں سنگ ہائے گراں بن کر حائل ہوئیں اور کس طرح وہ اس گرداب بلا سے اپنی کشتی حیات کو بچاتا ہوا نکلا - زندگی میں کن آدمیوں سے اس کا سابقہ پڑا اور ان کے متعلق اس کی آرا اور تاثرات کیا ہیں - اس زمانہ کا طرز معاشرت اور رہن سہن کیسا تھا اور رسم و رواج کی کیا کیفیت تھی - غرض آپ بیتی کے روپ میں ایک دور کی ہما ہمی اور گہما گہمی پوری طرح جلوہ گر ہوتی ہے - اور چونکہ خود نوشت سوانح حیات عموماً بڑے آدمی/ترتیب دیتے ہیں اس لئے قدرتی طور پر وہ مستقبل میں ابھرنے والی نسلوں کے لئے گراں بہا تجربات کا خزینہ اور بیش قیمت مشاہدات کا ایک سدابہار گلدستہ ہوتی ہیں - "[1]

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی لکھتے ہیں -

" اپنی زندگی کے احوال و واقعات کا بیان " آپ بیتی " کہلاتا ہے - اسے خود نوشت Autobiography بھی کہہ سکتے ہیں ــــــ آپ بیتی محض احوال و واقعات کا مجموعہ نہیں ہوتی بلکہ اکثر اوقات لکھنے والے کی داخلی کیفیتوں ، دلی احساس ، شخصی اور عملی تجربوں ، زندگی کے جذباتی پہلوؤں اور بحیثیت مجموعی زندگی کے

---

[1] عبد المجید قریشی - " آپ بیتی اردو ادب میں " - سہ ماہی الزبیر - آپ بیتی نمبر - بہاولپور - شمارہ 7 - 1964ء ، ص 29

بارے میں اس کے نقطہ نظر کی ترجمانی کرتی ہے ۔۔۔ لکھنے والا اپنے مزاج افتاد طبع اور انداز فکر و نظر کے مطابق آپ بیتی میں بعض پہلوؤں کو نمایاں کرتا اور ابھارتا ہے اور بعض پہلوؤں کو اختصار کے ساتھ سرسری انداز میں بیان کرتا ہے " [1]

"آپ بیتی " میں زندگی کے دونوں پہلو سامنے آ جاتے ہیں ۔ انسان خطا کا پتلا ہے ۔ آپ بیتی میں یہ موقع فراہم کرتی ہے کہ ہم اپنی خطاؤں کا اعتراف کریں ۔ اس میں ہر واقعہ سچا اور حقائق پر مبنی ہونا چاہئیے ۔ آپ بیتی افسانے اور ناول سے یکسر الگ صنف ہے اس میں تخیل کی رنگ آمیزی کی گنجائش نہیں ۔ اس میں فرضی اور بے بنیاد باتوں کے لئے کوئی جگہ نہیں ۔ اور جو آپ بیتی نگار خود کو ان سے باز نہیں رکھ پاتا اس کی داستان حیات تحریر میں بھی جھوٹ کا شکار ہو جاتی ہے ۔

ہمارے ہاں یہ انداز بھی پایا جاتا ہے کہ مصنف اپنے بارے میں معلومات فراہم کرتے ہوئے بہت سی باتوں سے گریز کرتا ہے ۔ اور منصب حاصل کرنے کے لئے مبالغہ اور طمع مکاری سے کام لیتا ہے ۔ وہ دانستہ یہ کوشش کرتا ہے کہ وہ خود کو دوسروں سے برتر ، منفرد اور اعلیٰ کردار شخصیت ثابت کرے وہ اپنی لغزشوں کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے اور اگر بفرض محال ان لغزشوں کا ذکر کرنا بھی پڑے تو وہ مصلحت کا سہارا ڈھونڈ تا ہے ۔

---

[1] ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی ، " اصناف ادب "
لاہور سنگ میل پبلیکیشنز اشاعت سوم 1983ء ، ص 166

مشرقی اقدار مغربی اقدار سے بے حد مختلف ہیں - ہمارے ہاں لوگ مذہب کی آڑ لے کر اپنی بہت سی کوتاہیوں کو چھپاتے ہیں - مغرب کی طرح ہم اپنی کوتاہیوں لغزشوں اور عیبوں کا اعتراف اس لئے بھی نہیں کرتے کیونکہ ہمیں بے شمار مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑے گا - دوسرے یہ کہ اپنی ذات سے محبت کا رجحان اور دوسروں کے رد عمل کا خوف ہر وقت ہمیں سچ کہنے سے باز رکھتا ہے- ڈاکٹر سید عبد اللہ لکھتے ہیں -

" کیا کوئی شخص اپنی آپ بیتی لکھ سکتا ہے ؟ شاید نہ لکھ سکے گا - کسی فرد پر جو کچھ بیتی ہے اس کا صحیح بیان تبھی ممکن ہوگا جب دنیا کے وہ سارے باسی (جن کی نظر سے کسی کی آپ بیتی گذرے گی) یا تو فرشتے بن جائیں جو تسبیح و تحلیل کے لئے مخلوق ہوتے ہیں (جیساکہ فرشتوں نے ازل کی امتحان گاہ اول میں اعلان کیا تھا)یا تب جب لکھنے والا چٹان کی مانند سنگ دل بن جائے - اسے دنیا کی رائے یا رد عمل کی کوئی پروا نہ ہو ، جس کے سینے سے بے ساختہ چشمے ابل پڑتے ہیں اور وہ اپنی سنگ دلی کے باوجود بے بس ہو جاتا ہے اور جو کچھ اس کے اندر ہوتا ہے ، اگل دیتا ہے -" سه[1]

ہماری مشرقی اقدار مغربی اقدار سے مختلف ہیں - اور ویسے بھی ہر عمل کا رد عمل ضرور ہوتا ہے مغرب میں جو باتیں قابل قبول ہیں ہمارے ہاں ان کو

سه[1] عبداللہ - سید - ڈاکٹر ، " وجہی سے عبدالحق تک " طبع دوم - لاہور - لاہور - مکتبہ خیابان ادب - 39 چیمبرلین روڈ - 1977ء ، ص 311

قبول کرنے میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا جاتا ہے ۔ مغرب میں آپ بیتی کا مصنف اپنی کہانی بلا کم و کاست بیان کرتا ہے وہ اپنی کمزوریوں خامیوں لغزشوں گناہوں کا برملا اعتراف کرتا ہے ۔ لیکن ہمارے ہاں ہر بات تو کھل کر کہنے کی اجازت نہیں دی جاتی ۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں شرم و حیا کا معیار مغرب سے مختلف ہے ۔ گو ہم نے اپنی زندگی میں بہت ساری ایسی باتوں کو جگہ دے رکھی ہے جو مشرقی اقدار کے منافی اور مغربی اقدار کے قریب تو ہیں ۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ ہماری نئی نسل مشرقی اقدار کی پاسدار ہو ۔ اور ہمارے بزرگ اپنی آپ بیتی میں اپنے ایسے کارنامے جن کی وجہ سے وہ نئی نسل کے سامنے شرمندہ ہوں ان کا ذکر نہیں کرتے ۔

آپ بیتی میں مصنف کو خود ہی مدعی ، گواہ اور جج بن کر حقائق سے پردہ اٹھانا ہوتا ہے ۔ جس میں بعض اوقات وہ کامیاب ہو جاتا ہے اور اکثر اوقات وہ حقائق سے پردہ اٹھانے کی بجائے حقائق کی پردہ پوشی کرنے لگتا ہے ۔ وہ نہیں چاہتا کہ اس کی ذات سب کے سامنے عریاں ہو جائے ۔ وہ دعویٰ تو یہ کرتا ہے کہ وہ خود کو کھلی کتاب کی طرح پیش کر رہا ہے لیکن اس سارے عمل میں وہ خود پر پردہ گرانے کے عمل میں مصروف رہتا ہے وہ چاہتا ہے کہ لوگ اسے اس طرح دیکھیں جس طرح وہ دکھنا چاہتا ہے نا کہ ویسے دیکھیں ، جیسا کہ وہ ہے ۔

آپ بیتی میں خواہ مصنف اپنی ذات سے پردہ اٹھائے یا پردہ گرائے یہ ایک ایسی صنف نثر ہے جو دلچسپی سے پڑھی جاتی ہے ۔ قارئین اس میں مصنف کی شخصیت کے ساتھ ساتھ بعض مقامات پر اپنی تصویریں یا عکس بھی دیکھتے ہیں ۔

جس سے انہیں ایک حد تک تسکین حاصل ہوتی ہے ۔ کسی دوسرے شخص کی آپ بیتی پڑھتے ہوئے ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان کسی دوسرے کے تجربے سے اپنی کسی الجھن کا حل تلاش کرلیتا ہے ۔ یوں اس کا ذاتی بوجھ ہلکا ہوجاتا ہے ۔آپ بیتی کے تمام کردار حقیقی ہوتے ہیں ان کے تمام افعال و اعمال حقیقی دکھائی دیتے ہیں اس میں افسانے کی طرح تخیل کی کارفرمائی نظر نہیں آتی بلکہ حقائق ہیں افراد کا حقیقی عمل دکھاتے ہیں ۔ذاتی تجربات کی وجہ سے اس میں جدت ، اقلیت صداقت نظر آتی ہے ۔ کیونکہ ادب خلا میں تخلیق نہیں ہوتا یہ حقیقت کا آئینہ دار ہوتا ہے اور ادب کو تنقید حیات کہا جاتا ہے ۔ گویا ایسا ادب جو زندگی کی حقیقتوں کے قریب تر ہے اسے ہم ادب عالیہ سے تعبیر کرتے ہیں ۔

" معمولی ادب اور اعلی ادب میں یہی فرق ہے کہ معمولی ادب میں مصنف سنی سنائی باتوں کا ذکر کرتا ہے اور اعلی ادب میں مصنف اپنے ذاتی تجربات کو پیش کرتا ہے ۔ اسی بنا پر کار لائل اعلی ادب کو " اصل آواز " اور معمولی ادب کو " آواز بازگشت " سے تعبیر کرتا ہے ۔" [1]

ادب زندگی کی تفسیر ہے ۔ ادیب اپنے ارد گرد جن واقعات کو دیکھتا ہے ان پر اثر انداز بھی ہوتا ہے اور ان سے اثر بھی قبول کرتا ہے ۔ وہ اپنے مشاہدے کو دوسروں کی نسبت بہتر طور پر ایک مخصوص انداز میں پیش کر سکتا ہے ۔ وہ اپنی

---

[1] سلام سندیلوی ۔ڈاکٹر ، " ادب کا تنقیدی مطالعہ " ۔ میری لائبریری ، طبع دوم لاہور ۔ 1964ء ، ص 18

ذہنی ، نفسیاتی اور جذباتی کیفیات کو بہتر طور پر جانتا ہے - وہ اپنی خارجی اور باطنی دنیا سے خوب خوب واقف ہوتا ہے - ہم کسی بھی شخص کی خارجی زندگی سے تو بہت حد تک واقف ہو سکتے ہیں لیکن اس کی باطنی دنیا ایک ایسا جزیرہ ہے جس تک سوائے کسی خاص شخص کے دوسرا نہیں پہنچ سکتا ہے - لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ کوئی دوسرا وہاں کبھی بھی نہیں پہنچ سکتا - اس کی ایک صورت ممکن ہے کہ کوئی آپ کو اپنے ساتھ لے کر اپنی اندر کی دنیا کی سیر کرائے - " آپ بیتی " بھی ایک ایسی صنف ہے جس میں مصنف قارئین کو اپنے ساتھ لے کر اپنی ذات کے سفر پر نکلتا ہے - گویا آپ بیتی میں داخلی اور خارجی زندگی اکٹھی نظر آتی ہیں -

ہمارے ہاں قدیم ادب میں ایسی آپ بیتیاں منظر عام پر آتی ہیں جن میں مصنف خارجی نوعیت کے واقعات کو اس قدر اہمیت دیتا ہے کہ وہ خارجی زندگی میں گم ہو جاتا ہے یہ آپ بیتیاں تاریخ کے قریب پہنچ جاتی ہیں -

ادب معاشرہ کا آئینہ دار ہے اور اسلوب شخصیت کا -

آپ بیتی لکھنے کے لئے ایک ایسی شخصیت کی ضرورت ہے جس میں ہمہ گیریت تنوع ہو - کیونکہ جس شخص کی زندگی میں کوئی بات منفرد ہی نہ ہوگی وہ کیا آپ بیتی لکھے گا - جب ہم کوئی آپ بیتی پڑھتے ہیں تو اس سے لکھنے والے کی افتاد طبع ، مزاج انداز فکر ، جیسے پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں -

" آپ بیتی " ذاتی اظہار کی دلپذیر صورت ہے - مشاہیر کے کارنامے قارئین کو مثبت تحریکات عمل کے لئے آمادہ کرتے ہیں - مثلاً زندگی بنانے کی کاوش - معاشی

تنگدستی - ناداری - محنت سے مقام تک رسائی - مطالعہ کتب - ذاتی تجربات کی بنا پر خدا شناسی وغیرہ -

چونکہ ادب معاشرے کا آئینہ دار ہے اس میں ہر طبقہ کی نمائندگی ہوتی ہے - ادیب ، ایکٹر ، کھلاڑی ، مزدور ، سیاستدان ، طوائف وغیرہ - گویا کسی بھی قوم کے اجتماعی شعور ، مجموعی ذہنی حالت کا اندازہ اس کے افراد کی ادب کے بارے میں پسند اور ناپسند سے لگایا جاسکتا ہے - کیونکہ ادب آسمان سے نہیں اترتا بلکہ اسی معاشرے میں تخلیق ہوتا ہے اور اس کو تخلیق کرنے والے بھی کسی اور جہاں کے باسی نہیں ہوتے بلکہ انسان ہوتے ہیں جن میں احساسات و جذبات ، شعور و لاشعور ، درگذر اور انتقام ، اور تمام بشری صفات موجود ہوتی ہیں - وہ اسی معاشرے کے کسی حصہ کا نمائندہ ہوتا ہے - ادب معاشرے میں ایک آئینے کی حیثیت رکھتا ہے جس میں انسان دوسروں کے عکس کے ساتھ ساتھ اپنے عکس سے بھی آشنا ہوتا ہے اور بعض اوقات ہم کسی کی تصویر دیکھ کر اپنی شکل کی جزوی مماثلت سے آشنا ہوجاتے ہیں اسی طرح کسی دوسرے کی آپ بیتی میں اپنی جھلک دیکھ لیتے ہیں - اور یوں اندھیری راہ میں ایک دیا روشن ہوکر ہمیں وہ راہ دکھاتا ہے جسے ہم فراموش کرچکے ہوتے ہیں - ایک عظیم شخصیت صرف اس لئے عظیم نہیں ہوتی کہ دوسرے اس کی عظمت کا اعتراف کرتے ہیں بلکہ ایک عظیم شخصیت اپنے اندر وسیع تر انسانی شخصیت کے امکانات رکھتی ہے -

خود نوشت سوانح عمری کا تعلق مشاہیر سے ہونا اس لئے بھی ضروری ہے کہ جب تک مرکزی کردار ایسا نہ ہو کہ لوگ اس کے بارے میں جاننا چاہیں تب تک

وہ اس کتاب کو پڑھیں گے بھی نہیں ۔ بوطیقا میں ارسطو نے حزنیہ کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کا ہیرو مشاہیر میں سے ہو ۔ تا کہ لوگوں کی زیادہ سے زیادہ توجہ اس کی طرف مبذول رہے ۔ آپ بیتی میں بھی شخصیت کا بھرپور اور مشہور ہونا ضروری ہے ۔ تا کہ پڑھنے والا اکتاہٹ کا شکار نہ ہو بلکہ وہ آپ بیتی کو اس لئے پڑھے کہ وہ شخصیت کے جملہ پہلوؤں سے آگاہ ہو ۔ ایسی شخصیات جن کا دنیا میں نام اور مقام ہے ان کی کامیابیاں اور ناکامیاں ہماری دلچسپی کا محور بن جاتی ہیں ۔ کیونکہ ان کا دائرہ محدود نہیں ہوتا ان مشاہیر کی کامیابی کو قوم کی کامیابی اور ان کی ناکامیوں کو قوم کی ناکامی تصور کیا جاتا ہے ۔ ان کی زندگی کا ارتقا قارئین کے لئے دلچسپی سمیٹے ہوئے ہوتا ہے ۔ اس لئے آپ بیتی لکھنے کے لئے ضروری ہے کہ آپ بیتی لکھنے والا محض یہ نہ دیکھے کہ وہ کچھ لکھ رہا ہے بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ خود سے باخبر ہو ۔ وہ اپنی ذات اپنی صفات سے پوری طرح آگاہ ہو ۔ کیونکہ اگر وہ محض اپنی زندگی کے اہم واقعات کو ترتیب دیتا ہے تو وہ ایک یادداشتوں کی ڈائری ترتیب دینے کے علاوہ کوئی اہم کام نہیں کر سکے گا ۔ خود شناسی کے لئے اسے اپنی ذات کے اندر سفر کرنا پڑے گا ۔ کیونکہ تجسس اور خود شناسی کے بغیر وہ ایک مؤثر آپ بیتی تحریر نہیں کر سکے گا ۔

آپ بیتی ہمیشہ صیغہ واحد متکلم میں لکھی جاتی ہے ۔ یعنی جو شخص اپنی سرگذشت بیان کرتا ہے وہ اپنے لئے " میں " کا صیغہ استعمال کرتا ہے ۔ آپ بیتی لکھنے والے کا اسلوب عام فہم سادہ ، رواں اور دلچسپ ہونا ضروری ہے تاکہ پڑھنے والا اس سے لطف اٹھانے کے ساتھ ساتھ سمجھ بھی سکے ۔ آپ بیتی

زیادہ طویل نہیں ہونی چاہئیے ۔ اس سے اس کی ضخامت توزیادہ ہوجائے گی لیکن اس کا تاثر قائم نہیں رہ سکے گا ۔ آپ بیتی زیادہ مختصر بھی نہیں ہونی چاہئیے کہ اس میں ابہام پیدا ہوجائے اور اس کا تخلیقی مقصد ختم ہوجائے ۔ چونکہ آپ بیتی کا تعلق حقیقت سے ہے اس لئیے اس میں مبالغہ اور تخیل کی رنگ آمیزی نہیں ہونی چاہئیے ۔ اگر ان دونوں کا استعمال ضرورت سے زیادہ ہوگا تو " آپ بیتی " افسانہ یا داستان بن کر رہ جائے گی ۔ تخیل کی رنگ آمیزی صرف دلچسپی تک رہنی چاہئیے ۔ تا کہ واقفیت اور حقیقت نگاری کا پہلو نمایاں رہے ۔ آپ بیتی لکھنے والے کا مطالعہ وسیع ہونا چاہئیے نیز زبان و بیان پر قدرت حاصل ہونی چاہئیے ۔ اس کا مشاہدہ عمیق اور دل جذبات سے معمور ہونا چاہئیے ۔ اگر اس میں یہ خوبیاں موجود ہوں گی تو وہ اپنے گہرے مشاہدے کے برتے پر ان باتوں کو بھی تحریر میں لا سکے گا جو عام ناظر کی نظر سے اوجھل رہتی ہیں ۔ وہ اہم اور غیر معمولی نوعیت کے واقعات کو چن کر اوراق پر منتقل کرتا ہے اور اس سے ایسی تصویر کھینچتا ہے جس کا ہر اعضاء مکمل اور ہر رنگ حقیقی دکھائی دیتا ہے ۔ مصنف کا انداز بیان شگفتہ ہونا چاہئیے ، اس کی تحریر میں پختگی ہونی چاہئیے تا کہ تحریر قارئین پر بھرپور تاثر چھوڑے ۔

ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں ۔

" آپ بیتی میں مواد اپنی ذات کـــــے اندر سے نکلتا ہے ۔
خود کوزہ اور خود ہی کوزہ گر ، خود ہی مجرم ، خود ہی گواہ
خود ہی جج ہوتا ہے اگر کوئی یہ کہے کہ آپ بیتی لکھنے والا شاعر

کی مانند اپنے تاثر پر انحصار کرتا ہے ۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ شاعر نے کبھی واقعاتی صحت کا دعوی نہیں کیا ۔ ۔۔۔ آپ بیتی میں صداقت خصوصی کی جستجو لازمی ہے ۔ اس کے علاوہ اسے جج بھی بننا ہے ۔ اور یوں جج بننے میں کوئی خاص دقت نہیں لیکن اپنا جج بننا ایک مشکل امر ہے ۔ جج بن کر اندر اندر سے اصلاح کرتے رہنا ممکن بلکہ اکثر ہوتا ہے مگر جج بن کر اپنے کو اشتہاری مجرم بنانے والے بہت کم دیکھے ہیں یہ قانون حفظ ذات کے خلاف ہے ۔" [1]

آپ بیتی کی اقسام -

آپ بیتی کی بہت سی اقسام ہیں ۔ ہم ان کا اجمال سے ذکر کرتے ہیں ۔

1 - ہمدردی کی اپیل کرتی ہوئی آپ بیتی ۔

2 - اپنی شخصیت کے استحکام اور تلافی مافات کی سعی پر مبنی آپ بیتی ۔

3 - اپنی ذات کی طرف محض داد اور سستی شہرت حاصل کرنے والی آپ بیتی ۔

4 - اپنی ذات کی دریافت اور فنی ابلاغ کی ضرورت کو پورا کرتی ہوئی آپ بیتی ۔

آپ بیتی لکھنا بظاہر جس قدر آسان کام لگتا ہے اسی قدر دشوار بھی ہے کیونکہ یہ انسانی فطرت ہے کہ ہم اپنی ذات کی تشہیر جس قدر چاہتے ہیں اسی قدر اپنی ذات کو چھپا ہوا بھی دیکھنا چاہتے ہیں ۔ آپ بیتی سوانح نگاروں کو نہایت مفید مواد فراہم کرتی ہیں ۔

---

[1] عبداللہ ۔ سید ۔ ڈاکٹر ، " وجہی سے عبدالحق تک " بار دوم لاہور مکتبہ خیابان ادب 1977ء ، ص 313 ۔ 314

ہمدردی کی اپیل کرتی ہوئی آپ بیتی میں مصنف سماجی نظام قانون اور اس کی اقدار کو قبول کرنے کے بعد رد کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے ۔ اور آپ بیتی کے ذریعے وہ معافی کا خواستگار دکھائی دیتا ہے ۔ ایسی آپ بیتی میں مصنف کا مقصد قارئین کے سامنے اعتراف کرنے کے ساتھ ساتھ ہمدردانہ سلوک کی اپیل بھی ہوتی ہے ۔

ایسی آپ بیتی جس میں مصنف اپنے طرز عمل کے جواز کی کوشش کرے اسے ہم دوسری قسم کی تصنیف میں شمار کریں گے ۔ اس میں مصنف اپنی غلطی کا اعتراف نہیں کرتا بلکہ وہ ایک ماحول میں اپنی شخصیت کے استحکام کے لئے تلافی مافات کا متلاشی دکھائی دیتا ہے ۔

بعض مشاہیر سستی شہرت حاصل کرنے کے لئے آپ بیتی لکھتے ہیں ان کا مقصد عوام کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانا ہوتا ہے ۔ وہ داد کے بھوکے ہوتے ہیں اس قسم کی آپ بیتی میں وہ اپنے محمود یا مذموم ، انوکھے امتیازات سے لوگوں کو آگاہ کرتے ہیں اور پوری کوشش کرتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح سے وہ عوام کی توجہ اپنی جانب کھینچ کر داد حاصل کریں ۔

اپنی ذات کی دریافت اور فنی ابلاغ کی ضرورت کو پورا کرتی ہوئی آپ بیتی میں مصنف اپنی ذات کی دریافت کرتا ہے ۔ وہ اپنی زندگی کے تمام واقعات کو منظر عام پر لاتا ہے اس کا مقصد محض داد حاصل کرنا یا ہمدردی کی اپیل کرنا نہیں ہوتا بلکہ وہ چاہتا ہے کہ وہ اپنی آپ بیتی سے انکشافات کرے ۔ وہ اپنی زندگی کے سفر کی مکمل تصور کشی کرتا ہے اور اپنے احساسات وجذبات ، تجربات کا

بر ملا اظہار کرتا ہے ۔ اس میں خود نمائی یا خود ستائی کا جذبہ موجزن دکھائی نہیں دیتا ۔ ایسی آپ بیتی اپنے اندر دلچسپی کے ساتھ ساتھ رہنمائی کے عناصر بھی رکھتی ہے ۔

بعض آپ بیتیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جن میں مصنف مسودوں کو مقفل کر دیتے ہیں اور اپنے ورثا کو وصیت کر دیتے ہیں کہ یہ ان کے انتقال کے بعد منظر عام پر آئیں ۔ یہ آپ بیتیاں یا تو جذباتی اظہار کی حامل ہوتی ہیں یا ان میں شدید خود پسندی ہوتی ہے ۔ اس کے علاوہ یہ بھی امکان ہے کہ ان آپ بیتیوں میں معاصرین کے بارے میں بہت زہر اگلا ہو ۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایسی آپ بیتیوں میں جھوٹ کی آمیزش ہو ۔ اور مصنف اپنی قلعی کھل جانے کے خوف سے ایسی وصیت کر جائے ۔

آل احمد سرور لکھتے ہیں ۔

" خود نوشت سوانح لکھنا بظاہر بہت آسان ہے ۔ لیکن دراصل خاصا مشکل ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ماضی کے واقعات کو کافی عرصہ گذر جانے کے بعد دہرانے میں مکمل معروضیت ممکن نہیں ہے ۔ جو واقعات پہلے گذر چکے ہیں ، وہ بعد میں یا تو کچھ بڑھے اور پھیلے ہوئے یا کچھ چھوٹے اور سکڑے ہوئے نظر آتے ہیں ۔ یہ صرف حافظے کی کرشمہ سازی نہیں ہے بلکہ وقت گذر جانے کے ساتھ آدمی کی شخصیت میں بھی کچھ تبدیلیاں ہو جاتی ہیں ۔" [1]

---

[1] آل احمد سرور ، " خواب باقی ہیں " لاہور فکشن ہاوس 1994ء حرف آغاز ، ص 5

گو آپ بیتی میں انسان کے اندر کی دنیا منظر عام پر آتی ہے اور کوئی شخص اپنے اندر کا سفر کرتا ہے - اور بظاہر وہ اپنے تجربات ، زندگی ، احساس کی بات کرتا ہے لیکن در حقیقت ہم اس کی ذات کے تناظر کے ذریعے اس عہد کی مخصوص معاشرت ، تاریخ ، تہذیب ، تمدن ، سیاست ، ثقافت ، مذہبی اقدار رسوم و رواج ، اخلاقی معیارات سے واقف ہوتے ہیں -

آپ بیتی میں جہاں مصنف اپنی ذات کا اظہار کرتا ہے وہاں کچھ باتوں کو چھپا بھی جاتا ہے - کیونکہ جو سچ انتشار کا سبب بنے اس کو مصلحت کے تحت چھپا لینا ہی بہتر ہوتا ہے - اس لئے کسی شخص سے اس بات کا تقاضا کرنا کہ اپنی آپ بیتی حرف بہ حرف سچ بیان کردے درست نہیں ہے جمیل احمد عدیل لکھتے ہیں -

" ہر نجی بات " اپنے سچ مچ کے ہمراز کو بھی نہیں بتائی جاسکتی ، دیکھنا یہ ہے کہ کون سی بات ظاہر کئے جانے کے قابل ہے اور کون سی چھپائے جانے کے لائق یقیناً جو بات ظاہر کئے جانے کے قابل ہے اسے مخفی رکھنا خیانت ہے مگر ہر نجی بات سر عام چوک میں رکھ دینا بھی دانشمندی نہیں - جنہوں نے قاری کو اپنا " صادق ہمراز " سمجھ کر اس پر ضرورت سے زیادہ اعتماد کیا - انہیں کی سر بازار رسوائی ہوتی ہے - کیونکہ قاری صرف قاری نہیں ہوتا بلکہ سخت گیر نقاد بھی ہوتا ہے - " [1]

---

[1] جمیل احمد عدیل ، " سیاق و سباق " لاہور عمیر پبلشرز بار اول 1995ء ص 53

آپ بیتی کی مختلف حیثیتیں ۔

آپ بیتی اپنی تخلیقی حیثیت میں یکسانیت کا شکار نہیں ہوتی اس میں قاری کے لئے زندگی سے دلچسپی کے جملہ حوالے موجود ہوتے ہیں ۔ آپ بیتی کا شمار ان اصناف میں ہوتا ہے جن میں قارئین نے ہمیشہ دلچسپی لی ۔ اللہ تعالی نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے جس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ انسان کو خدا نے ایک متجسس ذہن عطا کیا ہے ۔ جس کی ذات کی گہرائی اور وسعت کائنات سے بڑھ کر ہے ۔ وہ کائنات کو اپنی ذہانت اور تجسس کی بدولت تسخیر کر رہا ہے ۔ انسان کے داخلی اور خارجی مشاہدات اسے آگے بڑھنے پر آمادہ کرتے ہیں اور انجانی منزلوں کی نشاندہی کرتے ہیں ۔ وہ ان منزلوں تک پہنچنے کی کوشش کرتا رہتا ہے گویا وہ اپنے فن میں ڈوب کر سراغ زندگی پا لینے کا متلاشی رہتا ہے ۔ ہم فہم کی خاطر آپ بیتی کی چند بنیادی حیثیتوں کو اس طرح تقسیم کر سکتے ہیں ۔ تاریخی حیثیت ، اخلاقی حیثیت ، یادگاری حیثیت ، نفسیاتی حیثیت ،

ادب معاشرے کا عکس ہوتا ہے ۔ کسی بھی عہد کی روح کو اس عہد کے ادب میں تلاش کیا جاسکتا ہے ۔ ادب معاشرے اور سماج میں رہنے والا ادیب تخلیق کرتا ہے ۔ وہ معاشرے کا حصہ ہے وہ معاشرے کا نمائندہ ہے جو ماضی کی روایات کو مد نظر رکھتے ہوئے حال کا تجزیہ کرتا ہے اور لوگوں کی معاشی معاشرتی اور سماجی زندگی کی تصویر کشی کرتا ہے ۔ چونکہ آپ بیتی کا تعلق فرد اور سماج دونوں سے ہے اس لئے ہمیں آپ بیتی کی تاریخی حیثیت سے بھی انکار نہیں غلام رسول مہر لکھتے ہیں ۔

" ہم مختلف اصحاب کے مکاتیب یا تحریرات و مصنفات کو نگارشِ احوال کا بہترین ماخذ کیوں قرار دیتے ہیں ؟ محض اس لئے کہ انسان اپنے مکاتیب یا تحریرات و مصنفات میں کچھ لکھ جاتا ہے وہ زیادہ قابل اعتماد ہوتا ہے ------ دنیا کے عام ذخیرہ نگارش کی طرح آپ بیتی بھی نقد و نظر کی دسترس سے باہر نہیں - ہمارے لئے غور و فکر اور چھان بین کے ذریعے سے بہ ہمہ وجوہ صحیح واقعات اخذ کرلینا مشکل نہیں لیکن نفس معلومات صحیحہ کے نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے تو آپ بیتی کو ہر دوسرے ذخیرہ تاریخی اور انبار عبرت پر ترجیح حاصل ہے اور اس کے اعتراف میں تامل کیوں کیا جائے -" [1]

جب ہم کوئی آپ بیتی پڑھتے ہیں تو ہمارے سامنے محض وہ اکلوتی آپ بیتی نہیں ہوتی بلکہ اس عہد کی لکھی ہوئی اور آپ بیتیاں بھی ہمارے پیش نظر ہوتی ہیں - ان کے علاوہ اس عہد کی تاریخی کتب بھی موجود رہتی ہیں - ان معاصر آپ بیتیوں اور تاریخی کتب کے ذریعے ہمیں بے شمار شہادتیں مل جاتی ہیں - اور ہم میں یہ جذبہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم حقائق تک پہنچیں - ان ماخذوں تک رسائی حاصل کرنے کے بعد قاری اس مخصوص آپ بیتی پر ناقدانہ و محققانہ نظر دوڑاتا ہے کہ آیا جن حالات کا ذکر آپ بیتی کے مصنف نے کیا ہے کیا اس عہد میں وہ حالات موجود تھے اور اگر موجود تھے تو ان کی کیا وجوہ تھیں - گویا اس

---

[1] غلام رسول مہر ، " آپ بیتیوں کی اہمیت " نقوش - آپ بیتی نمبر لاہور ادارہ فروغ اردو جون 1964ء ، ص 38 - 37

طریقے سے ہم زیادہ مناسب طریقے سے تحقیق کے عمل سے گذر سکتے ہیں اور اس کے ذریعے اپنی رائے کو زیادہ مستحکم اور قابل قبول بنا سکتے ہیں ۔ اور اسی بنیاد پر ہم مصنف کے سچے یا جھوٹے ہونے کا اقرار کرتے ہیں ۔

آپ بیتی میں مصنف اپنے ذاتی حالات و واقعات ، ماحول ، عہد ، تہذیب و تمدن ، طرز معاشرت کی تصویر کشی کرتا ہے ۔ گویا آپ بیتی کسی فرد کی زندگی کا آئینہ بھی ہے جس میں اس کے ساتھ ساتھ اس کے عہد کا عکس بھی دکھائی دیتا ہے ۔ مثلاً خطوط غالب میں ہمیں غالب کے عہد کی معاشرت تہذیب و تمدن ، سیاسی و سماجی ، معاشرتی ، معاشی حالات کی تصویریں دکھائی دیتی ہیں ۔ گو ان خطوط میں غالب نے اپنے ذاتی غم کو بیان کیا ہے لیکن اس غم نے سارے سماج کے غم کو اس طرح سے محسوس کیا ہے کہ آج بھی جب ہم ان خطوط کو پڑھتے ہیں تو 1857ء کے حالات ہماری آنکھوں کے سامنے زندہ ہوجاتے ہیں ۔ غالب کے ان خطوط میں ان کے سوانحی حالات اور اس عہد کے انتظامی ، سیاسی ، تمدنی اور معاشرتی خاکے ہمارے سامنے ابھر آتے ہیں ۔

علم الدین سالک لکھتے ہیں ۔

" سوانح نگاری ایک قسم کی تاریخ ہوتی ہے ۔ تاریخ میں ایک قوم یا ایک ملک کے واقعات مربوط کر کے بیان کئے جاتے ہیں ۔۔۔۔ ان کتابوں کی مدد سے تاریخ کے خشک واقعات میں رنگ بھر کر دلکشی کے سامان پیدا کئے جاسکتے ہیں ۔ آج ہماری تاریخ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ واقعات کی کھتونی اور جنگ و جدل کا ایک مرقع ہے جس میں درباری رسوم

اور جنگ و جدل کی مار دھاڑ کے سوا اور کچھ بھی نہیں ۔ اگر ان کے ساتھ آپ بیتیوں کو ملا کر پڑھا جائے تو وہ چیز جس پر اہل یورپ کو ناز ہے بڑی آسانی کے ساتھ مرتب ہو سکتی ہے ۔" [1]

گو آپ بیتی کسی فرد واحد کی زندگی پر مشتمل ہوتی ہے ۔ اور اس میں وہ فرد واحد اپنی زندگی کے حقائق ہمارے سامنے رکھتا ہے ۔ اس میں واقعات کی صحت پر بھی خاص دھیان دیا جاتا ہے اور یہ بھی کوشش کی جاتی ہے کہ اس میں دلچسپی کا رنگ بھی چھایا رہے ۔ وہ جن واقعات کو اہم سمجھتا ہے انہیں درج کرتا ہے اور بعض برے بھلے واقعات اور حادثات جو اس کی نظر میں اہم ہوتے ہیں انہیں بیان کرتا ہے ۔ دیگر چیزوں کو رد کر دیتا ہے چونکہ انسان ایک سماجی جانور ہے اور وہ سماج میں رہنے والوں سے الگ تھلگ نہیں رہ سکتا ۔ اس لئے اس کی زندگی میں اس کی ذات کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں جو اس کی زندگی میں شامل رہے خواہ ان کی حیثیت سماج میں کچھ بھی ہو لیکن آپ بیتی میں وہ ایک اہم کردار کی صورت میں ابھرتے ہیں جو ہمیں مصنف کی شخصیت اور کردار کے بارے میں اہم معلومات فراہم کرتے ہیں ۔

ہر عہد کی مخصوص روایات اور تہذیب و تمدن ہوتا ہے ۔ گو اس کے بنیادی خد و خال صدیوں کے بعد تبدیل ہوتے ہیں لیکن فروعی چیزیں ہر عہد اور ہر زمانے میں بدلتی رہتی ہیں ۔ ان کی نشاندہی ہمیں عام تاریخی کتب میں نہیں ملتی اور ہمیں ان کے لئے آپ بیتیوں کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے کیونکہ آپ بیتیاں

---

[1] علم الدین سالک ، " آپ بیتیوں کے بعض نمایاں پہلو " ، نقوش ، لاہور ادارہ فروغ اردو ، جون 1964ء ، ص 40 تا 41

کسی قوم ، ملت اور تہذیب کے متعلق بھی اہم معلومات فراہم کرتی ہیں ۔

یوسف جمال انصاری لکھتے ہیں ۔

" سوانحی ادب کی عموماً اور آپ بیتی کی خصوصاً سہ گونہ حیثیت ہے۔ جسے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا ۔

(1) تاریخی حیثیت (2) اخلاقی حیثیت (3) یادگاری حیثیت ۔۔۔ باقی دو قسم کے امتیازات جو سوانحی ادب کو حاصل ہیں وہ تاریخی اور اخلاقی ہیں ۔ سوانح نگاری خواہ وہ حقیقت پر مبنی ہو اور جیتے جاگتے سچ مچ کے کرداروں کے سوانح پر مشتمل ہو اپنے دور کی تاریخ کو ضرور پیش نظر رکھی چلی آتی ہے ۔ چنانچہ ہم کسی دور کی تاریخ اس دور کی سوانح عمریوں سے مرتب کر سکتے ہیں ۔ اس ضمن میں مشہور انگریز مفکر و سوانح نگار تامس کارلائل کا قول ہے کہ " تاریخ بڑے آدمیوں کی سوانح کا نام ہے " اس قول میں دو نظریات کا امتزاج ہے ۔ اول یہ کہ بڑی شخصیتیں اپنے دور کی تاریخ بناتی ہیں کارلائل کے لئے یہ کہنا اس لئے درست تھا کہ اس نے ہیرو پرستی کے فلسفے کو رواج دیا ہے ، دوسرا پہلو اس قول کا یہ بھی ہے کہ کسی بڑی شخصیت کا مطالعہ اس کے تاریخی دور سے الگ رہ کر نہیں کیا جاسکتا ۔ چنانچہ سوانح عمری میں کسی خاص شخصیت کے سوانح ہی نہیں بلکہ اس دور کی تاریخ کا عکس بھی ہوتا ہے ۔ " [1]

---

[1] یوسف جمال انصاری ، " آپ بیتی اور اس کی مختلف صورتیں ، نقوش ص 81

جو سوانح نگار اپنی خود نوشت سوانح عمری لکھتے ہوئے قارئین سے کچھ نہ چھپائے بلکہ اپنے عہد کی تصویر کشی بھی کرے گیا وہ اپنی ذات کے ساتھ ساتھ قارئین کو اپنے عہد کی تصویریں بھی دکھاتا ہے جن کو مورخ بعض مصلحتوں کی بنا پر بیان نہیں کرتے اور وہ آنے والے زمانے کے لوگوں کے لئے الجھن کا باعث بنے رہتے ہیں ۔

تاریخی آپ بیتی کی ذیل میں " تزک تیموری " ، " تزک بابری " ، " تزک جہانگیری " کو دیکھا جاسکتا ہے ۔ ان آپ بیتیوں میں ہمیں وہ معلومات ملتی ہیں جن کی نشاندہی عام تاریخی کتب نہیں کر سکتیں ۔

مولانا جعفر تھانیسری کی " کالا پانی " سید ظہیر الدین دہلوی کی " داستان غدر " بھی تاریخی آپ بیتی کی کڑیاں ہیں ۔ ان میں ہم مصنف کے واقعات زیست اور حالات کے ساتھ ساتھ اس مخصوص عہد کی تہذیب اور بنیادی خد وخال سے آگاہ ہونے کے ساتھ ساتھ اس تہذیب کی عہد بہ عہد ترقی و تنزل سے بھی آگاہ ہوجاتے ہیں ۔

اخلاقی حیثیت ۔

سوانح عمری ہو یا خود نوشت سوانح کسی کا مقصد اخلاقیات کا پرچار کرنا نہیں ہوتا ۔ گو پہلے زمانے میں بڑی بڑی شخصیات کی سوانح اخلاقی نقطہ نظر سے تحریر کی جاتی تھیں اور یوں سوانح کو ایک طرف تو عظمت کا نشان بنا دیا جاتا تھا اور دوسری طرف اسے مرقع عبرت کا درجہ حاصل تھا ۔ گویا عظمت اور عبرت خود نوشت سوانح کی ایسی خوبیاں ہیں ان کے بغیر بات نہیں بنتی ۔ ان سوانح عمریوں

میں کسی فرد کی زندگی کے ارتقا پر روشنی ڈالی جاتی ہے ۔ کہ اس نے کیا کیا کارنامے سر انجام دئیے کیسے عروج حاصل کیا کن وجوہ کی بنا پر دوسروں کو رسوا کیا اور خود بھی رسوا ہوا ۔ کہاں شکست ہوئی اور کہاں اس نے شکست دی ۔ گویا جب ہم کسی عظیم شخصیت کی خود خونوشت سوانح پڑھتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اس نے دنیا میں کیا عظیم کارنامے انجام دئیے اور اس نے کس طرح مصائب کا سامنا کیا اور وہ کونسی وجوہات ہیں جن [illegible] شخصیت ہمیں دوسروں کی نسبت عظیم دکھائی دیتی ہے ۔

ALLAMA IQBAL
Open University Library
(ACQUISITION SECTION)
Acc. No. 82232
Date 12-12-89

ادب کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں لکھنے والے ایک دم سے پند و واعظ شروع نہیں کردیتے ۔ ادب کا تعلق اخلاقیات سے بھی ہے ۔ ہم ادیب و شاعر حضرات کو ملا یا واعظ سے تعبیر نہیں کر سکتے کیونکہ دونوں کا میدان الگ الگ ہے لہذا دونوں اس کے لئے لائحہ عمل بھی مختلف اختیار کرتے ہیں ۔ ادب، مذہب اور معاشرے کو بالکل الگ بھی نہیں کیا جاسکتا لیکن مذہب کو ان دونوں پر ٹھونسا بھی نہیں جا سکتا ۔ ادب کا تعلق محسوسات سے ہے اور اخلاق کا تعلق احساس سے ہے ۔

جب ایک سوانح نگار اپنی سوانح لکھتا ہے اور وہ بیان کرتا ہے کہ اس نے اس دنیا میں کن حالات کا سامنا کس طرح کیا ۔ اور کن وجوہ کی بنا پر وہ دوسروں سے الگ اور منفرد ٹھہرا ۔ زندگی کے معاملات میں اس نے کیسا انداز اپنایا اور کن وجوہ کی بنا پر دنیا نے اسے وہ مقام و مرتبہ دیا جس پر فائز ہو کر وہ ممتاز ٹھہرا ۔ جب عام قاری اس کی زندگی تجربات کو پڑھتا ہے تو اس کی نظر کے سامنے سے پردہ

اٹھ جاتا ہے اور وہ اپنی زندگی میں پیش آنے والے مسائل کا تجزیہ اس عظیم شخصیت کے مسائل سے کرتا ہے اور یوں کوئی مثبت حل تلاش کر لیتا ہے ۔ اسی وجہ سے عظیم شخصیات کے سوانح اصلاحی نقطہ نظر سے تحریر کئے گئے ۔ چونکہ اس میں بھی عظمت اور عبرت ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو دکھائی دیتی ہیں ۔

آپ بیتی میں آپ بیتی لکھنے والا اپنی زندگی کی خوبیوں اور خامیوں کا اعتراف کرتا ہے ۔ اور اگر وہ اپنے عیبوں کی پردہ پوشی نہ کرے بلکہ ان کو منظر عام پر لائے تو ایسی آپ بیتی اپنے فن کے اصولوں پر پوری اتر سکتی ہے ۔ مصنف کو چاہئیے کہ وہ اپنے تجربات زندگی اس طرح بیان کرے کہ وہ اپنے منہ میاں مٹھو نہ بنے بلکہ دوسرے اس کی عظمت کا اعتراف خود بخود کریں ۔

گو ہمارے ہاں اردو ادب میں آپ بیتیاں خالصتاً اخلاقی نقطہ نظر سے نہیں لکھی گئیں لیکن پھر بھی ان میں یہ عنصر دکھائی دیتا ہے کہ مصنف اپنی ذاتی اور خارجی زندگی کے حقائق اس طرح بیان کرتا ہے کہ پڑھنے والا اس سے حظ اٹھانے کے ساتھ ساتھ اس سے رہنمائی بھی حاصل کرے ۔ گویا مصنف اپنی آپ بیتی لکھ کر اپنا بوجھ اتار کر دوسرے کے کاندھے پر رکھ دیتا ہے ۔

ڈاکٹر سید شاہ علی لکھتے ہیں ۔

" عظیم انسانوں کی سوانح عمریوں کا مطالعہ نہایت عمدہ اور مستحسن جذبات پیدا کرتا ہے ۔ انسان ان کی صحبت میں اپنی خوبیوں ، خامیوں اور صلاحیتوں کا ان سے مقابلہ کرتا ہے ۔ اور اس طرح خود اعتمادی حاصل کرتا

ہے - ان کی لغزشوں سے بچنے کی کوشش کرتا ہے - جذباتی انتشار سے نجات حاصل کرتا ہے - اور ان کے نیک ارادوں اور عمل کے صحت مند اثرات کے مد نظر خود بھی اپنی زندگی کو اعلی تر مقاصد ، خدمت و اصلاح کے لئے وقف کر سکتا ہے -"

خدا نے دنیا کا نظام ایسا بنایا ہے کہ انسان دوسرے انسان کے تجربات سے کچھ نہ کچھ سیکھتا ہے - جن غلطیوں کا ارتکاب تباہی کے راستے پہ لے جائے ان سے بچنے کی کوشش کرتا ہے - یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ خود کو دوسروں کی نظروں میں معتبر دیکھنا چاہتا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ معاشرہ اس کو وہ مقام دے جس پر بیٹھ کر اس کی عزت میں اضافہ ہو - دنیا کی عظیم شخصیات کی زندگیوں کا مطالعہ ہمارے اندر ہمت ، حوصلہ ، جرات اور لگن پیدا کرتا ہے - آپ بیتی کے ذریعے انسان کی عظمت جہاں دوسروں کے لئے رہنمائی کا سامان فراہم کرتی ہے - وہاں انسان کی لغزشیں دوسروں کو سنبھلنے کا موقع فراہم کرتی ہیں - انسان کو خدا نے یہ خوبی ودیعت کی ہے کہ وہ دوسروں کی غلطیوں سے سبق سیکھتا ہے اور اپنی غلطی کو تسلیم کرتا ہے - گویا آپ بیتی ہمیں اس چیز کا موقع فراہم کرتی ہے کہ ہم کسی شخص کو اس کی لغزش اور کوتاہی پر محض لعنت ملامت نہ کریں بلکہ اگر کوئی خود اپنی لغزش یا غلطی کا اعتراف کرتا ہے تو اس کی عظمت کا اعتراف بھی برملا کیا جائے - اگر اس کی غلطی شدید نوعیت کی ہے اور ہم اس کی عظمت کا

---

1 سید شاہ علی - ڈاکٹر ، " اردو میں سوانح نگاری " ، کراچی گلڈ پبلیشنگ ہاوس جولائی 1961ء ، ص 329

اعتراف کرنے کا ظرف نہیں رکھتے وہ کم از کم شدید رد عمل کے اظہار کرنے کی بجائے اس پر ہمدردی سے غور ضرور کر سکتے ہیں ۔

آپ بیتی کی اخلاقی حیثیت سے انکار ممکن نہیں کیونکہ یہ ہمیں دوسروں کی خوبیوں خامیوں اور صلاحیتوں سے آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ ہمیں ان کے ساتھ موازنہ کرنے کی صلاحیت اور موقع بھی فراہم کرتی ہے ۔ اور یوں انسان کے ذہنی وفکری ارتقا کا عمل جاری رہتا ہے ۔ آپ بیتی ایک آئینے کے مماثل ہے جس میں ہم اپنا عکس دیکھ کر خود کو سنوار سکتے ہیں ۔ اور اس کے ذریعے محض دوسروں کا احتساب ہی نہیں کیا جاتا بلکہ قاری لا شعوری طور پر خود احتسابی کے عمل سے گذرتا ہے اور اپنی ذات کے تاریک گوشوں اور خوبیوں سے بھی آگاہ ہوتا ہے ۔

صوفیا کرام کے ملفوظات بھی آپ بیتی کی ایک صورت ہیں ۔
جب صوفیا کرام ہندوستان میں تبلیغ اسلام کے لئے کوشاں ہوئے تو وہ جہاں بھی گئے ان کی صحبت میں ہر طبقہ کے لوگ حاضر رہتے جو ان کے اخلاق ، کردار اور اطوار سے متاثر ہو کر اسلام قبول کرتے ۔ ان صوفیا کرام کے مرید ان کے اقوال کو لکھتے رہتے اور مرتب کرنے کے بعد ان ارشادات کو اپنے مرشد کو سناتے اگر مرشد ان کے درست ہونے کی سند دے دیتے تو دوسرے مرید اس کی نقول حاصل کرنے کے بعد حلقہ خاص و عام میں پھیلا دیتے ۔ صوفیا کرام کے یہ ملفوظات اخلاقی حیثیت کی آپ بیتی کی ذیل میں شمار ہوتے ہیں ۔ برصغیر پاک و ہند میں ملفوظات مرتب کرنے کا زمانہ شیخ نظام الدین اولیا سے شروع ہوتا ہے ۔ ان کے عہد میں خاصی احتیاط

ہوئی گئی لیکن ان سے پہلے مرتب ہونے والے ملفوظات کی حیثیت مشکوک ہے ۔ خواجہ حسن نظامی کی "آپ بیتی" میں اعترافات جیسا رنگ دکھائی دیتا ہے ۔ اس میں انہوں نے باقاعدہ اپنا محاسبہ کیا ہے اور بڑی حد تک اپنے عیوب پر بھی نظر ڈالی ہے ۔

یادگاری حیثیت ۔

آپ بیتی کی ایک حیثیت یادگاری بھی ہے ۔ انسان کی یہ فطرت ہے کہ وہ اپنی نسل کی بقا چاہتا ہے اور اپنی ذات کا اظہار چاہتا ہے ۔ وہ چاہتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح اس دنیا میں اپنی موت کے بعد بھی زندہ رہے ۔ یہ ہی خواہش انسان کے اندر اولاد کی طلب پیدا کرتی ہے ۔ اسی خواہش کی وجہ سے وہ دنیا میں اپنی زندگی میں ہی کچھ یادگاریں تعمیر کرواتا ہے ۔ اپنے نام پر اپنے گھر کا نام رکھتا ہے ۔ سوانح نگار بھی جب اپنی سوانح لکھتا ہے تو دنیا میں بعد از مرگ زندہ رہنے کا جذبہ بھی اسے تحریک دیتا ہے ۔ مشہور شخصیات اپنی آپ بیتی خود لکھنا چاہتی ہیں تا کہ وہ لوگوں کے سامنے حقائق اس طرح لائیں کہ لوگ ان سے ہمدردی کریں اور لوگوں کے دل میں ان کے لئے منفی جذبات پیدا نہ ہوں ۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کل کو کوئی دوسرا شخص ان کی سوانح لکھے تو وہ ان کے ساتھ انصاف نہ کرسکے ہر بڑے آدمی کے اندر ایک چھوٹا آدمی بھی ہوتا ہے ۔ جو اسے رد عمل کے خوف میں مبتلا رکھتا ہے ۔

لہذا آپ بیتی لکھنے والا اپنی آپ بیتی اس طرح مرتب کرتا ہے کہ اس کی

زندگی کے اہم واقعات اور یادگاری لمحات کتاب بن جاتے ہیں ۔ اور اس کے منظر عام پر آنے کے بعد لوگوں پر حقائق کھلتے ہیں ۔ اور وہ شخص اپنے کارناموں کی بدولت اہم قرار پاتا ہے ۔ گو عام قارئین آپ بیتی میں لکھے واقعات پر ایمان نہیں لاتے وہ ان پر تنقید بھی کرتے ہیں ۔ مگر وہ شخص اپنی تحریر کے ذریعے ان کے دل پر نشان چھوڑ جاتا ہے ۔

یوسف جمال انصاری لکھتے ہیں ۔

" شخصیت نگاری ـــ اب ایک فن ہی نہیں بلکہ ایک سائنس بھی ہے ۔ ماحول اور وراثت کے بغیر شخصیت نہیں بنتی ۔ چنانچہ دور حاضر کا سوانح نگار اپنے یا دوسروں کے سوانح حیات اس طرح مرتب کرتا ہے کہ قارئین سمجھ سکیں کہ صاحب سوانح کس حد تک وراثت کا منت پذیر رہا اور کس حد تک ماحول کا احسان مند " [1]

اس دنیا میں اپنا نام چھوڑ جانے کی خواہش نے انسان سے فنون لطیفہ تخلیق کروائے ، خطاطی ، مصوری ، موسیقی ، شاعری ، گویا فن ہماری ذات کے اظہار سے الگ نہیں ہے انسان سمجھتا ہے کہ وہ بقائے دوام اسی صورت میں حاصل کر سکتا ہے جب وہ اس دنیا میں کوئی ایسا فن پارہ چھوڑ جائے جو اپنی مثال آپ ہو ۔ آپ بیتی بھی ایک ایسا ہی نقش ہے جو مشاہیر اس دنیا میں چھوڑ جاتے ہیں ۔ وہ اپنے حالات زندگی لکھ کر روحانی سکون اور مسرت حاصل کرتے ہیں ۔ وہ اپنی کتاب زندگی کو اس طرح مرتب کرتے ہیں کہ اس میں صفحات کی کوئی قید نہیں ہوتی وہ چاہیں تو اپنی زندگی کے ایک ایک لمحہ میں دوسروں کو شریک کرسکتے ہیں ۔

---

[1] یوسف جمال انصاری ، " آپ بیتی اور اس کی مختلف صورتیں "
نقوش ، ص 79

وہ اپنی زندگی کے تمام اہم اور غیر اہم واقعات کو اس طرح ترتیب دیتے ہیں کہ قاری ان کو پڑھتے پڑھتے ان میں گم ہوجاتا ہے اور اگر تحریر جاندار ہو تو وہ صاحب تصنیف کے ساتھ ماضی کے ان زمانوں میں سفر کرنے لگتا ہے جن کو اس نے دیکھا نہیں ۔ مولانا فضل الحسن حسرت موہانی کی " قید فرنگ میں ان دو سالوں کی تکالیف اور پریشانیوں کی تصویر کشی دکھائی دیتی ہے جو انہوں نے قید میں گذارے ۔

یہ آپ بیتی حسرت پر بیتنے والے لمحات اور کیفیات کی ترجمان ہے اور ان کی زندگی کے تھوڑے حصے کی مکمل داستان کہی جاسکتی ہے ۔ سید ہمایوں مرزا کی " میری کہانی میری زبانی " بھی یادگاری حیثیت کی آپ بیتیوں میں شمار ہوتی ہے اس میں انہوں نے اپنی زندگی کے کم و بیش تمام مراحل یعنی بچپن سے لے کر وفات سے کچھ عرصہ پہلے تک کے حالات درج کئے ہیں ۔ اس میں انہوں نے اپنی داستان حیات کے ساتھ ساتھ ذہنی ، جذباتی ، نفسیاتی کیفیات ، تاثرات اور محسوسات کو بھی قلمبند کیا ہے جس سے ان کی آپ بیتی کا قد دیگر آپ بیتیوں سے بلند نظر آتا ہے ۔

نفسیاتی حیثیت ۔

انسان اپنی ذات میں کائنات کے سارے درد وغم کو سمیٹے ہوئے ہوتا ہے ۔ بعض اوقات وہ اپنے حوصلے توآزماتا ہے اور اپنی ذات کے دکھ کو اپنی ذات کا جوہر بنانے کی کوشش کرتا ہے ۔ ایسی امثال چند ایک ہوتی ہیں ۔ کیونکہ یہ انسان

کی فطرت ہے کہ وہ اپنا درد والم دوسروں سے بانٹتا ہے وہ اپنے غم کو دوسروں کے سامنے بیان کرتا ہے اور اس احساس سے دوچار ہوتا ہے کہ اس نے اپنا جی ہلکا کرلیا ۔ انسان سماجی جانور ہونے کی وجہ سے اپنی خوشیوں اور غموں میں دوسروں کو شریک کرکے سکون اور راحت محسوس کرتا ہے ۔ چونکہ آپ بیتی کا تعلق انسان کی حیات سے ہے جو کھٹے اور میٹھے تلخ و شیریں ذائقوں سے بھری پڑی ہے لہذا آپ بیتی کا مصنف دوسروں کو ان یادوں میں شریک کرکے اپنے جی کا بوجھ ہلکا کرتا ہے ۔ گویا آپ بیتی بھی انسان کے کتھارسس کا ایک ذریعہ بن جاتی ہے ۔

فرائڈ کہتا ہے کہ انسانی شخصیت برف کے ایک تودے کی مانند ہے جس کا زیادہ حصہ پانی کی تہہ کے نیچے اور کچھ حصہ پانی کی سطح کے اوپر دکھائی دیتا ہے ۔ اس بات کا مطلب یہ ہے کہ جب ہم کسی شخصیت کو دیکھتے ہیں تو بظاہر اس کی خارجی شخصیت کا مطالعہ کرتے ہیں ۔ یہ انسان اپنے خارج سے زیادہ اپنے باطن میں رہتا ہے گویا

ع اک قبا اور بھی ہم زیر قبا رکھتے ہیں ۔

جسم خاکی میں خدا نے ہمارا باطن بھی بنایا ہے ۔ جس کا مطالعہ نفسیاتی مطالعہ کہلاتا ہے ۔ اور اس نفسیاتی مطالعے کے لئے آپ بیتی بہترین صورت ہے ۔

جمیل احمد عدیل لکھتے ہیں ۔

" انسان اپنے جن تجربات کو فراموش کرچکا ہوتا ہے ، درحقیقت وہ بھولے نہیں ہوتے بلکہ وقتی طور پر اس کے شعور کے نیچے دبے ہوئے ہوتے ہیں کیونکہ انھیں سے انسانی طرز عمل کی ساخت معین ہوتی رہتی ہے ۔

اگر یہ منفی رنگ اختیار کر جائیں تو دماغی عوارض اور نفسیاتی
الجھنیں اسے چاروں جوانب سے گھیر لیتی ہیں ۔ انسانی نفس کے
عمق میں جو لاشعور کی طاقتیں کارفرما ہیں وہی اس کی ذات ،
شخصیت اور طرز احساس اور اس کے مطابق اعمال کے رخ کو متعین
کرتی ہیں ۔" [1]

ادب کی صحیح انداز میں سمجھ اور پرکھ کے لئے قاری کا مصنف کے ذہنی میلانات اور رجحانات سے آگاہ ہونا ضروری ہے اور اس سلسلے میں " آپ بیتی " سب سے زیادہ مفید اور اہم ثابت ہوتی ہے جس میں عمر رفتہ کے جستہ جستہ مناظر دکھائی دیتے ہیں ۔ آپ بیتی دیگر نثری اصناف سے اس لئے بھی مختلف ہے کہ اس میں تخیل کی کارفرمائی دکھائی نہیں دیتی بلکہ حقیقت تخیل کا آنچل اوڑھے بغیر اپنے حقیقی روپ میں جلوہ گر ہوتی ہے ۔ ہم کسی بھی شاعر یا ادیب کی جملہ تخلیقات سے اسی صورت میں واقف ہو سکتے ہیں جب ہم اس کے سوانح سے واقف ہوں جب ہم اس کی سوانح اور تخلیقات کا تجزیاتی مطالعہ کریں گے تبھی اس کے افکار تک رسائی حاصل کر سکیں گے ۔

ڈاکٹر سید شاہ علی لکھتے ہیں ۔

" آپ بیتی میں شخصیت کے دلسوز مظاہر چلتے ہیں اور طریق و قواعد
کے ظاہری قیود کم ہیں ۔ انکشاف ذات کی تربیت میں شعوری مقصد یا

---

[1] جمیل احمد عدیل ، " سیاق و سباق " لاہور عمیر پبلشرز
بار اول 1995ء ، ص 50

کسی کی تقلید کا اس قدر پتہ نہیں چلتا جتنا کہ ذہن و کردار کی مشابہت یا کسی پُر اثر ذہنی تحریک کا۔اس طرح آپ بیتی علم نفسیات کی قلم رو میں داخل ہوجاتی ہے اور اہم ترین سوانحی دستاویز بن جاتی ہے۔" سے[1]

گویا ماحول اور وراثت کے ساتھ ساتھ شخصیت کے مخصوص عناصر اس کی شخصیت کی تکمیل کرتے ہیں ۔ لہذا آپ بیتی ہمیں یہ موقع فراہم کرتی ہے کہ ہم نفسیات اور تجزیہ نفس کے ذریعے مصنف کے شعور اور لا شعور میں جھانکیں ۔ تاکہ ہم یہ دیکھ سکیں کہ کن وجوہ کی بنا پر اس کے ہاں ان افکار نے جنم لیا ۔ اور مصنف کی جملہ تخلیقات میں ان افکار کی باز گشت کیوں سنائی دیتی ہے اس کی کیا وجوہ ہیں ۔ زمانے کے حالات و حوادث نے مصنف کی ذات پر مثبت اثرات مرتب کئے یا منفی اثرات چھوڑے ۔

آپ بیتی مصنف کی داخلی زندگی کے تغیرات پر روشنی ڈالتی ہے ۔ وہ مصنف کے ہر عمل کی ایک نفسیاتی وجہ بھی پیش کرتی ہے ۔ گو مصنف یہ سب کچھ جان بوجھ کر نہیں کرتا بلکہ یہ اس سے ہوتا چلا جاتا ہے اور قاری مصنف کا نفسیاتی تجزیہ کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے ۔ اور مصنف یہ دیکھتا ہے کہ انسانی جذبے کس طرح لفظ بن کر اس کی باطنی دنیا سے پھوٹتے ہیں ۔

مختصر یہ کہ آپ بیتی محض کسی شخصیت کی داستان حیات ہی نہیں ہوتی

سے[1] سید شاہ علی ۔ ڈاکٹر ، "اردو میں سوانح نگاری"
کراچی گلڈ پبلشنگ ہاوس ۔ طبع اول ، 1961 ء ، ص 71

بلکہ یہ صنف نثر انسان کو سنبھلنے کے مواقع فراہم کرتی ہے ۔ اس کی تاریخی، اخلاقی، یادگاری اور نفسیاتی حیثیتوں سے انکار ممکن نہیں ہے ۔ آپ بیتی خواہ کسی ارادے کے تحت لکھی جائے یا بلا ارادہ اس کی افادیت کم زیادہ ہو سکتی ہے مگر اس کی افادیت سے انکار کرنا ممکن نہیں ۔

آپ بیتی کی دیگر صورتیں ۔

اردو ادب میں آپ بیتی بطور ایک فن بہت دیر سے روشناس ہوئی ۔ لہذا اردو ادب میں خود نوشت سوانح عمریاں تعداد کے لحاظ سے بھی کم دکھائی دیتی ہیں ۔ گو آپ بیتی کا فن ہمارے ہاں دیر سے آیا لیکن مشاہیر و مصنفین کے حالات زندگی اس سے پہلے بھی دکھائی دیتے ہیں ۔ مثلاً بعض مضامین میں مضمون نگار نے اپنے ذاتی مشاہدات اور تجربات تحریر کئے ہیں ۔ ان کے علاوہ قدیم دواوین اور نثر کی کتابوں میں بھی شاعروں اور نثر نگاروں کی داستان حیات کے ٹکڑے دکھائی دیتے ہیں ۔ گو ان ٹکڑوں میں بہت ابتدائی باتیں مثلاً نام سال ولادت، تخلص، حسب نسب، مسکن وغیرہ کا اندراج ملتا ہے ۔ ان کے علاوہ ایسی سوانح عمریاں بھی دکھائی دیتی ہیں ۔ جو مخطوطات کے قلمی مسودات، خطوط وغیرہ میں بھی دکھائی دیتی ہیں ۔

ڈاکٹر سید عبد اللہ لکھتے ہیں ۔

" اردو میں لکھی ہوئی آپ بیتیاں بھی کئی طرح کی ہیں :

1۔ مکمل حالات زندگی ۔

2 ۔ زندگی کے کسی حصے کی روداد یا ایسی سوانح عمری جس کی مدد سے

اپنے اہم فن یا اہم کارنامے کے ارتقا کی داستان مرتب کی ہو۔

3 - روزنامچے اور سفر نامے -

4 - کسی کی کہانی اس کی زبانی -

5 - شخصی انشائیے - " [1]

آپ بیتی ، ناول اور افسانہ -

آپ بیتی کی ابتدائی صورتیں ہمیں ناول اور افسانے میں بھی دکھائی دیتی ہیں ، ناول اور افسانے میں مصنف بعض اوقات اپنے تجربات و احساسات کو فرضی کرداروں کے ذریعے پیش کرتا ہے - قاری کے لئے حقیقی اور فرضی کردار میں تمیز کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہوتی - وہ اس طرح ایک انسانی تجربے کو پڑھتا ہے۔ اٹھارہیں اور انیسویں صدی میں سچی کہانیوں کو بہت دلچسپی سے پڑھا جاتا تھا - ناول یا افسانے کو سوانح عمری یا سرگذشت کہا جاتا تھا اور لوگ انہیں ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے - ان میں مصنف اپنی ذات کو پس پردہ رکھ کر حقیقی یا افسانوی کرداروں کے حالات پیش کرتا تھا - جس سے آپ بیتی کی شاعرانہ صورت ہمارے سامنے آئی - اور ناول کے ارتقا پر سوانح نگاری نے اپنے اثرات مرتب کئے اور ناول میں اصلی وادنی ہر دو طرح کے کرداروں کے حالات زندگی ہمارے سامنے آتے - جس سے نثر کے ارتقا میں سوانحی ادب کو خاطر خواہ فایدہ پہنچا - (نمونے رسوا کا امراؤ جان ادا ، ممتاز مفتی کا علی پور کا ایلی) آپ بیتی اور انشائیہ - اور

---

[1] عبداللہ - سید - ڈاکٹر ، " وجہی سے عبدالحق تک "
لاہور مکتبہ خیابان ادب ، طبع دوم ، 1977ء ، ص 318

قراۃ العین حیدر گردش رنگ چمن ۔

چھاپے کی ایجاد کے بعد پہلے فرانس اور پھر انگلستان میں انشائیے نے آنکھ کھولی ۔ یہ ایک ایسی صنف نثر ہے جس میں انشائیہ نگار اپنے احساسات و خیالات کو ضبط تحریر میں لاتا ہے ۔ یہ مضامین ایک طرح کی آپ بیتی ہیں کیونکہ ان میں آپ بیتی کی طرح ایک ذاتی صفت موجود ہے لکھنے والے کے احساسات و جذبات اور اس کی باطنی کیفیت کے عکاس ہوتے ہیں ۔ اردو زبان میں انشائیہ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں وجود میں آیا ۔ انشائیے اور آپ بیتی میں گہری مماثلت ہے ۔ چونکہ انشائیہ لکھنے والے کے رد عمل اور ذاتی احساسات و خیالات کا وسیلہ اظہار ہے ۔ خواجہ حسن نظامی کی انشائیوں کی کتاب " سی پارۂ دل " اس کی بہترین مثال ہے ۔

خطوط اور آپ بیتی ۔

گو خطوط انسان اس لئے نہیں لکھتا کہ وہ کل کو چھپیں لیکن کسی بھی اہم شخصیت کے خطوط اگر ہم دیکھیں تو ہمیں اس کی داستان حیات کے مختلف ٹکڑے ان میں دکھائی دیں گے ۔ چونکہ خط و کتابت ایک فطری اور بے تکلف ذریعہ اظہار ہے جس میں انسان اپنی زندگی کے حالات لکھتا چلا جاتا ہے ۔ گویا خطوط بذات خود خود نوشت سوانح عمری ہوتے ہیں ۔ جن میں ہمیں اس کے لکھنے والے کے ساتھ ساتھ اس کے عہد معاشرت تمدن و تہذیب کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں ۔

(مثلاً خطوط غالب) غبار خاطر ، مکتوبات نیاز فتح پوری ، خطوط اقبال ۔

روز نامچے اور آپ بیتی ۔

روز نامچے بھی آپ بیتی کی ابتدائی شکل ہیں ۔ روزانہ ڈائری لکھنا دنیا کی اہم شخصیتوں کا مشغلہ رہا ہے ۔ یہ روز نامچے بے حد اہمیت کے حامل ہوتے ہیں ان میں لکھنے والے کے مشاغل ، سیرت و کردار کے ساتھ ساتھ اس کے عہد کے حالات کا بھی پتا چلتا ہے جن میں اس کا سوانحی مواد ملتا ہے ۔ گو لکھنے والا محض اپنی یاد داشت کے لئے روز نامچہ تحریر کرتا ہے ۔ اس کا اس تحریر کو لکھنے کا مقصد محض یاد داشت بھی ہو سکتا ہے اور ان کی اشاعت کروانا بھی ہو سکتا ہے ۔ دونوں صورتوں میں یہ روز نامچے آپ بیتی کے قریب ہوتے ہیں کیونکہ ان میں مصنف کے روز و شب کی تفصیل درج ہوتی ہے ۔ اس کی ایک خوبصورت مثال قاضی عبدالغفار کے "لیلی کے خطوط" اور "مجنوں کی ڈائری" ہے ۔

آپ بیتی اور مثنوی ۔

اردو ادب میں مثنوی ایک ایسی صنف سخن ہے جسے ہر عہد میں مقبولیت حاصل رہی ہے ۔ قدیم داستانوں کو مثنوی میں سموکر بیان کیا گیا ۔ چونکہ یہ ایک بیانیہ صنف ہے اس لئے شاعر اس میں اپنے ذاتی تاثرات و احساسات کے ساتھ ساتھ دوسروں کے احوال کو بھی اس میں سمو دیتا تھا ۔ گو اس میں تاریخی واقعات کو فرضی کرداروں کے ذریعے بیان کیا جاتا رہا ہے ۔ اس لئے اس میں آپ بیتی سے زیادہ جگ بیتی کے عناصر چھائے دکھائی دیتے ہیں ۔ مثنویوں میں جو پیرائیہ اظہار

برتا جاتا ہے اس میں ہم کسی بھی عہد کی پوری جھلک دیکھ سکتے ہیں اس میں شاعر اصل قصہ بیان کرنے سے قبل اپنے حالات اپنے عہد کے حالات اس طرح سے بیان کرتا ہے کہ ہمیں اس شاعر اور اس کے عہد کے متعلق ایسا مواد مل جاتا ہے جس میں آپ بیتی کی صورت ابھرنے لگتی ہے ۔ اس میں ہمیں رزمیہ قصے بھی دکھائی دیتے ہیں ۔ شاعر اعلی کرداروں کی عظمت کا اعتراف اس طرح کرتا ہے کہ ان کی شجاعت کی تصویر قاری کے سامنے کھنچ جاتی ہے نظامی کا سکندر نامہ ، وارث شاہ کی ہیر ، میر حسن کی سحرالبیان ، دیا شنکر نسیم کی گلزار نسیم اس کے اعلی نمونے ہیں ۔

آپ بیتی اور تذکرے ۔

مشرق میں تذکرہ نگاری کو شروع ہی سے اہمیت حاصل رہی ہے ۔ ابتدائی تاریخ ادب اردو بھی انہیں تذکروں کی شکل میں مرتب کی گئی ۔ ان تذکروں میں اس عہد کی تاریخ کے ساتھ ساتھ اس عہد کے شاعروں کے سوانحی حالات کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے ۔

یوسف جمال انصاری لکھتے ہیں ۔

" بعض لکھنے والوں نے خود اپنا تذکرہ اپنے قلم سے لکھا ہے ۔ یہ سلسلہ یوں تو میر حسن اور مصحفی سے شروع ہوتا ہے اور حسرت موہانی تک چلا جاتا ہے لیکن یہ بھی عجیب بات ہے کہ مشرقی عجز وانکسار نے ان تذکرہ نویسوں کو کھل کر اپنی ذات کے متعلق بات کرنے کی اجازت نہیں

دی - دوسروں کے حالات میں تو انہوں نے پوری کی پوری کتابیں لکھ ڈالیں لیکن جب اپنی باری آئی تو اپنے متعلق چند سطروں ہی میں اشارہ کرکے رہ گئے - بہر حال ان اشارات کو مجتمع کرکے خود مصنف کے الفاظ کو اس طرح ترتیب دیا جاسکتا ہے کہ ان کے خود نوشت حالات یکجا ہوجائیں -" [1]

آپ بیتی اور انٹرویو -

موجودہ دور صحافت کا دور ہے جس میں صحافی حضرات مختلف شخصیات کے پاس ایک سوالنامہ لے کر جاتے ہیں اور ان کے ذریعے کسی بھی اہم شخصیت کے حالات اور سوانح یکجا کرلیتے ہیں - سوالنامہ اس طرح مرتب کیا جاتا ہے کہ بہت سے اہم پہلو خود بخود ہمارے سامنے آجاتے ہیں - گو یہ خود نوشت سوانح تو نہیں لیکن کسی بھی شخصیت کے متعلق خود اس کے ہاتھ کی تحریر میں سوانح کے چند مناظر سامنے آتے ہیں -

اس طرح سفرنامے رپورتاژ میں بھی آپ بیتی کا عنصر گھلا ملا دکھائی دیتا ہے - ان کو ہم مکمل خود نوشت سوانح تو نہیں کہہ سکتے لیکن ہمیں ان کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے - کہ آپ بیتی نے کن کن اصناف میں اپنا مقام بنایا ہے اور ہمیں کس کس صنف میں اس کے عناصر ملتے ہیں - مختلف کتابوں کے دیباچے بھی ہمیں مصنف کے متعلق اہم معلومات فراہم کرتے ہیں - سفرناموں اور رپورتاژ

[1] یوسف جمال انصاری ، "آپ بیتی اور اس کی مختلف صورتیں" نقوش ، ص 75

میں مصنف کے ذاتی تجربات اور احساسات کا حسین امتزاج ملتا ہے ۔

اسی طرح اصناف سخن میں غزل ، مثنوی ، قصیدہ ، رباعی ، قطعات ، میں بھی شاعر اپنے انفرادی تجربے کو بیان کرتا ہے گو ان میں اپنی داستان حیات کو بیان کرنا سہل نہیں لیکن پھر بھی ان میں کچھ نہ کچھ آپ بیتی کے بیان کا رنگ جھلکتا ہوا نظر آتا ہے ۔

یہ الگ بات ہے کہ شعر میں " سوانح عمری " کے اظہار اور بیان میں حقیقت سے زیادہ تخیل کا رنگ موجود ہو سکتا ہے ۔ جو شاعر کو بھرپور اعتبار دینے سے قاصر ہے ۔

*****

باب دوم

اردو میں آپ بیتی کی روایت

باب دوم

" اردو میں آپ بیتی کی روایـــت "

سوانح عمری اور آپ بیتی میں فرق ۔

ادب میں بے شمار اصناف ہیں جن کا تعلق افراد سے ، ان کے احساسات و جذبات سے ، معاشرے کے جملہ سیاسی شقافتی سماجی ، معاشی معاشرتی تہذیبی وتمدنی حالات سے ہے ۔ گیا ادب تہذیب و معاشرت کی عکاسی کرتا ہے گو ادب کی چند اصناف میں تخیل کی کارفرمائی دکھائی دیتی ہے مگر سوچ کہیں ایک فرد کی ہوتی ہے جس کا تعلق زمین سے ہے ۔ ادب میں ہمیں انسان اور اس کی زندگی دو موضوعات مختلف شکلوں میں ملتے ہیں ۔

" آپ بیتی " اور " سوانح عمری " دو ایسی مختلف اصناف ہیں جن کا تعلق کسی ایک شخص کی زندگی سے ہوتا ہے ۔ اور یوں مختلف اصناف ہونے کے باوجود اس میں ہمیں بہت سی مماثلتیں اور فرق دکھائی دیتے ہیں ۔ جو ان دونوں کی پہچان میں مدد دیتے ہیں ۔ دونوں میں سب سے بڑا اور بنیادی فرق یہ ہے کہ " آپ بیتی " میں مصنف خود اپنے متعلق انکشافات کرتا ہے ۔ اور بتاتا ہے کہ میں در حقیقت کیا ہوں ۔ جبکہ سوانح عمری میں کوئی مصنف کسی دوسرے شخص کی حیات اور کارناموں کو پیش کرتا ہـــــے ۔

رانا محمد صفدر ادا لکھتے ہیں۔

"آپ بیتی سوانح عمری سے بلند مرتبے کی حامل ہے ۔ سوانح عمری میں مصنف ، اپنے ممدوح سے عقیدت کے باعث واقعات کے بیان میں مصلحت سے کام لیتا ہے ----- بعض کمزور پہلو سوانح نگار کی گرفت میں نہیں آ سکتے ۔ چوبیس گھنٹوں کے دوران ایک انسان کے ساتھ جو کچھ بیتتا ہے کسی دوسرے کو اس کا علم کیسے ہو سکتا ہے جبکہ آپ بیتی میں مصنف ایک بے رحم حقیقت نگار ہوتا ہے وہ دوسروں کا لحاظ رکھے بغیر اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیتا ہے ۔ اعترافات گناہوں کا بوجھ ہلکا کر دیتے ہیں ۔ ویسے بھی مصنف یہ سمجھتا ہے کہ جو واقعات اس سے سرزد ہو چکے ہیں وہ دوسروں کے لئے تجربات کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ اب دوسرے چاہے اس سے سبق سیکھیں یا اسے بیکار گردانیں " [1]

جب کسی اہم شخصیت کی سوانح عمری لکھی جاتی ہے تو اس کے لئے مصنف اس شخصیت کی ذاتی تحریروں کے علاوہ دیگر کتب ، خطوط ، روزنامچوں ، مضامین ، انٹرویوز ، سرکاری ریکارڈز اور معاصرین کی آرا وغیرہ سے بھی مدد لیتا ہے ۔ جبکہ " آپ بیتی " میں مصنف اپنی یاد داشت اور سچائی پر یقین رکھتے ہوئے اپنے سینے میں دفن رازوں کو شٹول کر خود کو قارئین کے سامنے منکشف کردیتا ہے۔

---

[1] رانا محمد صفدر ادا ، " اردو آپ بیتی کی تاریخ آغاز سے 1947ء تک " مقالہ برائے ایم فل اردو ۔ مخزونہ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی ، اسلام آباد ، ص 23

سوانح عمری عموماً کسی شخصیت سے مرعوب ہو کر لکھی جاتی ہے۔ چند سوانح عمریوں کو چھوڑ کر اکثر سوانح عمریاں شخصیات کے انتقال کے بعد منظر عام پر آئیں۔ یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص کے سوانح دو مختلف لوگ لکھیں اور اس میں ہمیں اسی شخص کی زندگی کے متضاد نظریے نظر آئیں۔ سوانح عمری کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن ایک بات جو کہ محسوس ہوتی ہے وہ یہ کہ آپ بیتی کی سوانح عمری کے مقابلے میں مستقل حیثیت ہے۔ چونکہ اس میں مصنف اپنی حیات کے بارے میں خود ہی اعترافات کرتا ہے گو یہ مصنف کی حیات سے وفات تک کے عرصے پر محیط نہیں ہوتی لیکن زندگی کسے ایک بڑے حصے پر محیط ہوتی ہے جس میں ہمیں کسی عظیم شخصیت کی حیات کے ساتھ ساتھ اس کے افکار اور نظریات کا ارتقا بھی نظر آتا ہے ۔ آل احمد سرور لکھتے ہیں۔

" میری بیوی اکثر میری تحریریں تنقیدی نظر سے پڑھتی ہے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ اس میں ایمان داری برتے ، وہ نہ تو یہ کوشش کرے کہ اپنی تلخیوں ، محرومیوں اور ناکامیوں کی داستان بیان کرکے اپنے دل کی بھڑاس نکالے ، نہ اپنے آپ کو خلاصہ کائنات سمجھ کر ہر شخص اور واقعہ پر ہمالہ کی بلندی سے تنقید کرے۔ نہ اپنا کوئی بت بناکر پیش کرے تا کہ لوگ اس کی پرستش کریں اور نہ واقعات کو توڑ موڑ کر اپنے کسی نظریے کے شکنجے میں دم بدم بدلتی ہوئی ، متضاد ، رنگا رنگ ،

حیرت انگیز جلوہ ہائے نوبہ نو سے معمور زندگی کو کسی اشتہار باز

کی سرچنوں سے آلودہ کرے ۔ جھوٹا ایک فن ہے اور آپ بیتی ایک فن

لطیف ، اس سے عہدہ برا ہونے کے لئے بڑی سچائی ، بڑے ریاض ،

بڑے کھرے پن کی ضرورت ہے اس کا راستہ بھی پل صراط کی طرح بال

سے باریک اور تلوار سے تیز ہے ۔" [1]

اس اقتباس کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ داستان حیات کہنے کے لئے جس قدر کھرے پن ، ریاض اور سچائی کی ضرورت ہے اس کے لئے جس قدر وسعت دل درکار ہے وہ آپ بیتی میں ہی ممکن ہے ۔

" آٹو بائیوگرافی " کو بائیوگرافی کی بہن کہا جاتا ہے ۔ سوانح عمری ارادتاً لکھی جاتی ہے مصنف پہلے سے اس کی تیاری کرتا ہے ۔ جبکہ آپ بیتی نگار پہلے سے منصوبہ نہیں بناتا بلکہ یہ ایک اتفاقی تحریک ہوتی ہے جو اسے آپ بیتی لکھنے پر آپ ہی آپ آمادہ کرتی ہے ۔ اس میں انکشاف ذات کا عمل کارفرما ہوتا ہے ۔

ایک اور بڑا فرق یہ ہے کہ آپ بیتی میں مصنف اپنے باطن کی دنیا کی سیر کرتا ہے ۔ اور اس باطن کی دنیا سے دوسرے لوگ اسی صورت میں آگاہ ہوسکتے ہیں ۔ جب آپ بیتی نگار ان کی انگلی تھام کر ان کو اپنی داخلی دنیا دیکھنے کی دعوت دے اور اپنے باطن کے دروازے وا کردے ۔ اس مقام پر پہنچ کر قاری پر مصنف

---

[1] " خواب باقی ہیں " آل احمد سرور " اعتراف " لاہور فکشن ہاوس ۔ 1996ء ، ص 807

کے بارے میں وہ انکشافات ہوتے ہیں - جو اس سے پہلے ان کے وہم وگمان میں بھی نہ تھے آپ بیتی مصنف کے احساسات وجذبات ، نفسیاتی کیفیتوں کی غماز ہوتی جبکہ سوانح عمری میں اس کی گنجائش نہیں ہے - کیونکہ وہ منتخب شخصیت کی داخلی دنیا میں داخل ہی نہیں ہو سکتا -

ڈاکٹر سید شاہ علی اس فرق کے بارے یوں رقمطراز ہیں -

"خود نوشت سوانح نگار کے لئے اس کی پردہ داری کہ وہ کس قسم کا انسان ہے - نا ممکن ہے - اس کا طرز بیان ہی اسے ظاہر کردیتا ہے - چونکہ وہ اپنے آپ سے بہترین واقفیت رکھتا ہے وہ اپنی تصویر بھی عمدہ ترین پیش کر سکتا ہے - بہر حال سوانح نگار جو اس سے کم تر معلومات کا مالک ہے اس سے صحیح تر تصویر نہیں کھینچ سکتا - خود نوشت سوانح عمری کو پس پردہ داخلے کی اجازت دیتی ہے اور وہ وہاں سے ہر ایک چیز کا مطالعہ کر سکتا ہے گویا یہ تصنیف اس کے لئے ایک آئینہ ہے جس میں مصنف کے خدوخال اور شخصیت کا عکس دیکھ سکتا ہے -" [1]

سوانح عمری لکھنے کے مقابلے میں آپ بیتی لکھنا ایک دشوار کام ہے انسان کی فطرت ہے کہ وہ دوسروں کے عیب منٹوں میں گنا دیتا ہے اور اپنے عیب پر اس کی نظر جائے بھی تو وہ دیکھا ان دیکھا کردیتا ہے کیونکہ یہ انسان کی فطرت

---

[1] شاہ علی - سید - ڈاکٹر ، " اردو میں سوانح نگاری "
کراچی گلڈ پبلشنگ ہاوس طبع اول 1961ء ص 70 - 71

ہے کہ وہ خود کو ہر لحاظ سے مکمل اور برتر دیکھنا چاہتا ہے ۔ اس لئے آپ بیتی لکھنا عام شخص کے بس کی بات نہیں ۔

سوانح عمری میں کسی دوسرے شخص کی حیات کا عکس دکھایا جاتا ہے اس لئے سوانح نگار کے پاس زیادہ مواقع ہوتے ہیں کہ وہ اپنی منتخب کردہ شخصیت پر کھل کر لکھے ۔ آپ بیتی لکھنے والے کو خود اپنا مصنف بننا پڑتا ہے خود اپنے مضحک پہلوؤں کو پیش کرنا پڑتا ہے جو کہ یقیناً ایک جراًت مندانہ قدم ہے ۔

ان دونوں کے درمیان ایک اور نمایاں فرق یہ ہے " آپ بیتی " ساری زندگی پر محیط نہیں ہوتی اس میں موت کا سفر بیان نہیں کیا جا سکتا لیکن مصنف اپنے بچپن کے واقعات و حالات سے لے کر اس خاص عہد تک جس تک لکھنے کا اس نے منصوبہ بنایا ہوتا ہے اس عہد کی قلمی تصویر کشی کرتا ہے جبکہ سوانح نگار مہد سے لحد تک کے واقعات کو ترتیب دیتا ہے ۔ گویا آپ بیتی میں سچائی کا عنصر سوانح عمری سے زیادہ ہوتا ہے ۔

آپ بیتی کے اہم عناصر ۔

" آپ بیتی " ایک انسانی زندگی کی داستان ہے ۔ جس میں بہت سے موڑ آتے ہیں ۔ اس زندگی میں انسان بہت کچھ کھوتا اور بہت کچھ پاتا ہے اور بعض اوقات پانے کے لئے بہت کچھ کھونا بھی پڑتا ہے کچھ فیصلے انسان کے اپنے ہوتے ہیں اور کچھ فیصلے قدرت پہلے سے کئے ہوئے ہوتی ہے ۔ خوشیاں غم ،

عزت ذلت ، خوشحالی تنگدستی ، راحت و آلام کے اس تانے بانے کو ہم زندگی کا نام دیتے ہیں اور جب کوئی شخص اپنی زندگی کے اس سفر کو صفحہ قرطاس پر منتقل کرنا چاہتا ہے تو اسے یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ آیا وہ اپنی زندگی کے بارے میں سچ بیان کر رہا ہے یا یہاں بھی جھوٹ کی آمیزش ہے ۔ حقیقت یہ کہ سچ کا گھونٹ کڑوا ہوتا ہے لیکن یہ ہی کڑوا گھونٹ آپ بیتی کو زندگی عطا کرتا ہے اور جھوٹ کا میٹھا زہر آپ بیتی کو پنپنے نہیں دیتا ۔ اس لئے آپ بیتی میں ان تین اہم عناصر کا ہونا ضروری ہے ۔

(1) سچائی (2) شخصیت (3) فن

سچائی :

اس بارے میں الطاف فاطمہ لکھتی ہیں ۔

" ایک اچھا آپ بیتی لکھنے والا جانتا ہے کہ جو اعمال اور افعال خود اس سے سرزد ہو چکے ہیں ۔ ان کا تعلق اس کی ذات سے اتنا رہ جاتا ہے کہ وہ اس کے نام اور ذات سے منسوب ہیں اور اب وہ دوسروں کی امانت ہیں کیونکہ دوسروں کو ان سے سبق لینا ہوتا ہے۔" [1]

آپ بیتی درحقیقت ایک شخصی تاریخ ہے ۔ اور تاریخ کی اہمیت اس کی سچائی میں مضمر ہے ۔ آپ بیتی کا مصنف اپنی ذات کا عکس پیش کرتا ہے اور یہ عکس ہمیں جاندار اور متحرک اسی صورت میں نظر آئے گا جب اس میں زندہ رہنے

---

1 الطاف فاطمہ ، " اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقاء "
اردو اکیڈمی سندھ ، کراچی ۔ بار اول 1961ء ، ص 21

کی صفت موجود ہوگی ۔ تحریر ہو یا تقریر اس کو زندگی اس کی سچائی دیتی ہے ۔ چونکہ آپ بیتی کا تعلق اس مخصوص شخص سے ہی نہیں بلکہ معاشرے کے ان افراد سے بھی ہوتا ہے جو اسے پڑھتے ہیں ۔ لہذا مصنف اپنی آپ بیتی میں اپنے مسائل و مشکلات ، نظریات وافکار ، جذبات و احساسات عقلی اندازے اور تجربات کو اس طرح سے پیش کرتا ہے کہ وہ دوسروں کے لئے محض ایک رنگین داستان بن کر نہ رہ جائیں بلکہ وہ اس سے سبق حاصل کریں ۔

من گھڑت واقعات اور تخیلاتی چیزوں میں انسان ایک حد تک دلچسپی کا اظہار کرتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ ان میں کچھ حقیقت نہیں ہے ۔ ان من گھڑت قصوں اور تخیلاتی چیزوں کو قدیم عہد میں دلچسپی سے پڑھا سنا جاتا ہوگا جب انسان کو اپنے وقت کی قدر و قیمت کا احساس نہیں تھا ۔ اب اس دور میں جب انسان پہلے سے زیادہ با شعور ہوگیا ہے اور پہلے سے زیادہ مصروف ہوگیا ہے ، اسے اپنے وقت کی قدر و قیمت کا احساس ہے لہذا وہ فضول مشاغل میں دلچسپی کا اظہار کرنے کے بجائے ان چیزوں پر توجہ دیتا ہے جو اس کو فائدہ پہنچائیں جن کا تعلق حاضر اشیاء سے ہو جو اس کی رہنمائی کریں اور اس پر زندگی کے نئے معنی آشکار کریں ۔

آپ بیتی پڑھتے ہوئے بھی قارئین کے ہاں ہمیں ایسا ہی انداز نظر آتا ہے ۔ تحریر کے دوران میں اسے جہاں بھی جھوٹ اور تخیل کا احساس ہو جاتا ہے ۔ وہ وہیں پر اپنے مصنف سے غیر بن جاتا ہے ۔ گویا سچائی ایک ایسی ڈور ہے جو قاری اور مصنف کو ایک ہی لڑی میں پروتی ہے ۔

گو ادب میں ناول اور افسانہ میں بھی حقیقت نگاری سے کام لیا جاتا ہے لیکن ان کے واقعات سچائی پر مشتمل نہیں ہوتے بلکہ مصنف اپنی منشا کے مطابق ان کو ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے ۔ جبکہ آپ بیتی میں اگر مصنف سچائی کا دامن ہاتھ سے چھوڑدے تو ایسی آپ بیتیاں منظر عام پر آکر مصنف کی زندگی میں ہی دم توڑدیتی ہیں ۔ اور یوں اس کتاب کے ساتھ ساتھ اس کے مصنف کا تاثر بھی وہ نہیں رہتا جس کی وجہ سے وہ اپنی آپ بیتی تحریر کرتا ہے ۔

اردو ادب میں روسو کی " اعترافات " جیسی آپ بیتی ابھی تک منظر عام پر نہیں آئی لیکن اس سے متاثر ہوکر جن لوگوں نے لکھا ان کو بہت سخت تنقید کا سامنا کرنا پڑا ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری مشرقی اقدار مغرب کی اقدار سے یکسر مختلف ہیں لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم ان اقدار کا سہارا لے کر خود کو ایک فرشتہ زیادہ اور انسان کم دکھائیں ۔

ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں ۔

" اردو میں سچائی کے نام سے بدی کی ترغیب کا کاروبار کچھ زیادہ چمکا نہیں کیونکہ یہاں بدی کو تقاضائے بشریت سمجھنے کے باوجود کوئی ایسی چیز نہیں سمجھا جاتا جس کی تشہیر کی جائے ۔" [1]

لیکن سچائی سے مراد یہاں بھی یہی ہے کہ انسان خود کو جو وہ ہے من و عن بیان کردے لیکن صرف اپنی کتاب کو سستی شہرت دلانے کے لئے خود ساختہ قصوں

---

[1] عبداللہ ۔ سید ۔ ڈاکٹر ، " وجہی سے عبدالحق تک "
لاہور مکتبہ خیابان ادب ، طبع دوم 1977ء ، ص 319

اور فحش ضروری جنسی واقعات سے بوجھل نہ بناتے۔ جس سے اس کی آپ بیتی کا مقصد ہی فوت ہوجائے۔ اور نہ ہی وہ خود پر ایسا خول چڑھالے کہ خول تو نظر آئے لیکن اس میں چھپی ہوئی شخصیت کو نہ تو آنکھ چھو سکے۔ اور نہ ہی وہ شخصیت دل کو چھو سکے۔ گویا آپ بیتی میں یہ عنصر اس کی سب سے بڑی خوبی ہے۔

شخصیت :

" آپ بیتی " کا مرکزی کردار اس کا مصنف ہوتا ہے۔ اس میں جو واقعات درج ہوتے ہیں ان کا پہلا تعلق اسی اہم اور مرکزی کردار سے ہوتا ہے۔ آپ بیتی لکھنے والی شخصیت کا اہم ہونا بہت ضروری ہے وہ شخصیت ایسی ہونی چاہئیے جس کو جاننے والے لوگوں کی تعداد زیادہ ہو اور لوگ اس کے متعلق اور زیادہ جاننے کے خواہشمند ہوں۔ اس کا تعلق زندگی کے کسی بھی شعبے سے ہو۔ لیکن اس معروف شخصیت کی زندگی کے ارتقا پر روشنی کے منتظر لوگ ایسے ہوں جو واقعی یہ جاننے کے خواہشمند ہوں کہ وہ شخص اپنی حقیقی زندگی میں کیا تھا اس نے اس زندگی کے سفر کو کس طرح طے کیا وہ کن کن منزلوں اور مقامات پر ٹھہرا اور ان مقامات نے اس کی زندگی میں کیا کردار ادا کیا۔

آپ بیتی لکھنے کو تو کوئی بھی شخص لکھ سکتا ہے لیکن آپ بیتی لکھنے کے لئے شخصیت کا ہمہ گیر ہونا ضروری ہے چونکہ ادب معاشرے کا آئینہ دار ہوتا ہے اس لئے آپ بیتی لکھنے والے کی شخصیت کا اہم اور منفرد ہونا بھی ضروری

ہے تاکہ وہ معاشرے کے کسی ایک طبقے کی نمائندگی کر سکے - یہ ذاتی اظہار کی دلپذیر صورت ہے جس کے ذریعے آپ بیتی لکھنے والا اپنے قارئین کو مثبت تحریکات اور عمل کے لئے آمادہ کر سکتا ہے - خود نوشت سوانح عمری میں مصنف اپنی زندگی اپنے محاسن و معائب کو حقیقت کے آئینے میں ظاہر کرتا ہے -

آپ بیتی میں کسی بھی شخصیت کے متنوع پہلوؤں اور اس کی زندگی کی رنگا رنگی کی تصویر کشی نظر آتی ہے گویا آپ بیتی ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ایسے مقامات آتے ہیں جب قاری اس میں اپنا عکس دیکھنے لگتا ہے اور وہ مصنف سے نظر ہٹا کر خود اپنا احتساب کرنے لگتا ہے - آپ بیتی میں ہمیں مرکزی کردار مصنف کی ذات دکھائی دیتی ہے لیکن زندگی کے اس تانے بانے میں جن دوسرے کرداروں سے اس کی ذات وابستہ ہوتی ہے وہ بھی اس کے ارد گرد دکھائی دیتے ہیں جس سے فرد اور معاشرے کے باہمی ربط پر بھی روشنی پڑتی ہے -

آپ بیتی لکھنے والی شخصیت اپنی زندگی کے تجربات سے دوسروں کی رہنمائی کرتی ہے وہ اپنی موجودہ عظمت کے حصول کے لئے جن تجربات سے گذرتی ہے ان کا اظہار کرتی ہے نیز وہ اپنے عہد کی اہم تاریخی ، سیاسی ، سماجی ، مذہبی ، معاشرتی اور ادبی تبدیلیوں کا ذکر اس طرح سے کرتی ہے کہ ان تبدیلیوں کی مطالعے کے ساتھ ساتھ مصنف کی ذات پر ان تبدیلیوں کے اثرات بھی سامنے آنے لگتے ہیں -

قارئین جب کسی آپ بیتی کو پڑھتے ہیں تو پہلے وہ شخصیت پر نظر

ڈالتے ہیں اور سب سے پہلا جذبہ ان کے اندر یہ بیدار ہوتا ہے ۔ کہ وہ دیکھیں کہ وہ کونسی صلاحتیں تھیں جن کی بنا پر وہ شخصیت دوسروں سے ممتاز اور منفرد ٹھہری ، وہ اس عظیم شخصیت کی بشری لغزشوں سے بھی واقف ہونا چاہتا ہے گویا وہ اس شخصیت کے جملہ پہلوؤں کو دیکھنا چاہتا ہے اور اگر مصنف ان سب باتوں کو بیان کرے تو یہ مصنف کی جرات کی دلیل ہے کہ اس نے سچائی سے کام لیتے ہوئے اپنا آپ قاری کے سامنے کھول دیا ۔ یہ سچائی قارئین میں بھی جرات پیدا کرتی ہے ۔

ریحانہ خانم لکھتی ہیں ۔

" آپ بیتی لکھنے والے کے لئیے اس فن کو نہایت ہوشمندی سے ملحوظ رکھنا چاہیے تا کہ نہ تو اس پر اخفا اور چھپانے کا الزام ہو اور نہ ہی اس کی تصنیف زندگی جنتی طویل ہو کر بار بن جائے ۔ اپنی سرگذشت ہو یا کسی کی سوانح عمری اس میں یہ دکھانا بھی ضروری ہے کہ چشمہ کس زمین سے نکلا اور کن راہوں سے گذرتا ہوا کہاں تک پہنچا ۔ مگر ایسا نہ ہو کہ ماحول اور زمانہ اور حسب و نسب کی باتیں اس طرح چھا جائیں کہ اصل مقصد وفات پا جائے ۔" [1]

---

[1] ریحانہ خانم ، " فن آپ بیتی اور آپ بیتیاں " سہ ماہی الزبیر 1964ء ۔ آپ بیتی نمبر ، بہاولپور اردو اکیڈمی ، ص 12

فــن -

کہتے ہیں زندگی کے اسٹیج پر ہر کردار اپنا رول ادا کرتا ہے اور چلا جاتا ہے - گویا ہر کردار کی اپنی ایک حیثیت ہے کچھ کردار مرکزی حیثیت کے حامل ہوتے ہیں اور کچھ کرداروں کی نوعیت ضمنی ہوتی ہے لیکن ہر کوئی اپنا کردار ادا کرتا ہے اور یوں زندگی کا ڈراما اپنے انجام کو پہنچ جاتا ہے - زندگی گذارنا ایک فن ہے کچھ لوگ اسے حادثاتی طور پر گذارتے ہیں اور کچھ لوگ اس کی اہمیت سے واقف ہوتے ہیں اور وہ اپنے آپ کو حالات کے دھارے پہ نہیں چھوڑدیتے بلکہ وہ اپنے فیصلوں اور سوجھ کے سہارے اسے بہتر بنانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں -

اپنی ذات کا اظہار کرنا ہر ذی شعور کی خواہش ہوتی ہے - فطرت نے اسے جو صفات ودیعت کی ہیں وہ ان کا اظہار کرتا ہے اور اپنی صفات کو وہ اپنی شخصیت کا خاصا جانتا ہے - آپ بیتی کی صنف بھی اپنی ذات کے اظہار کا نام ہے یہ صنف بھی ایک فن ہے جس طرح زندگی گذارنا ایک فن ہے اسی طرح اسی زندگی کو سپرد قلم کرنا ایک فن ہے - جس کے مصنف کو بہت سوچ بچار کرنی پڑتی ہے کہ وہ کیا کرے کہ جس سے اس کی زندگی کی مکمل تصویر کھنچ جائے جس میں ایک لکیر بھی زائد نہ ہو اور کوئی رنگ بھی غیر مانوس نظر نہ آئے- آپ بیتی کی صنف فنون لطیفہ کی ایک خوبصورت مثال ہے -

چونکہ اس میں مصنف اپنی ذات کا اظہار کرتا ہے اس لئے اس کا شمار ادب عالیہ میں ہوتا ہے - اس میں مصنف اپنی زندگی کے داخلی و خارجی مشاہدات کو بیان کرتا ہے - آپ بیتی کی تاریخی نفسیاتی ، یادگاری اور اخلاقی حیثیت اپنی جگہ مسلم ہے لیکن اس کی ادبی حیثیت بھی مستحکم ہے - چونکہ اس کا حرف بہ حرف سچ کا متقاضی ہے اس لئے یہ تحریر ایک فن کی حیثیت رکھتی ہے۔

اپنی ساری زندگی کے حالات و واقعات کو اس طرح بیان کرنا کہ قاری کے سامنے اس کی متحرک تصویر کھنچ جائے ایک مشکل کام ہے - مصنف اپنی زندگی کے ہر عمل کو گرفت میں نہیں لاتا بلکہ وہ اپنی زندگی کے ان واقعات کو منتخب کرتا ہے جو اس کی نظر میں اہمیت کے حامل ہوتے ہیں - وہ اپنی آپ بیتی میں دلکشی پیدا کرنے کے لئے حالات و واقعات کی ترتیب و تنظیم اس طرح کرتا ہے کہ اس کی فنکارانہ صلاحتیں سامنے آتی ہیں -

ریحانہ خانم لکھتی ہیں -

" فن کے نقطہ نظر سے بھی آپ بیتی لکھنے والے اور کسی کی سوانح لکھنے والے سے ایک ہی بات مقصود ہے - واقعات کے جمع کرنے کے بعد اس طرح سے ترتیب و تدوین کی جائے کہ شخصی زندگی بالکل اسی طرح سامنے آئے جس طرح وہ اپنی حیات میں رہی - سب سے بہترین طریقہ تو یہی ہے کہ شروع سے آخر تک واقعات کی ترتیب کا وہی لحاظ رکھا جائے جو اصل زندگی میں تھا یعنی انسان کو جو کچھ پہلے

درپیش ہوا وہ پہلے اور جو بعد میں ہوا بعد میں دکھایا جائے۔"[1]

گویا زندگی کے ہر لمحے کو تحریر کرنا مشکل کام ہے اور بعض غیر ضروری باتوں کو درج کرنا بھی مناسب نہیں لہذا اپنی زندگی پر ناقدانہ نظر ڈالنے کے بعد اس میں سے اہم و غیر اہم واقعات کو الگ کرنا ایک فن ہے ہر واقعے کو مناسب اور زندگی کی تقویم کے لحاظ سے جگہ دینا فنکاری ہے۔

آپ بیتی کا فن سادہ اسلوب ، سلیس انداز کا متقاضی ہے۔ اس سے اس کی فنی خوبیوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ جس قدر سادہ اسلوب اور بے تکلف انداز تحریر اپنا یا جائے گا تحریر زندگی کے اس قدر قریب ہوگی۔ اس میں افسانوی تخیل کی گنجائش نہیں ہوتی بلکہ مصنف کو نہایت فنکارانہ انداز میں اپنی تحریر کو دلکش بنانا پڑتا ہے۔ اور اس کو خیال رکھنا پڑتا ہے کہ آپ بیتی جگ بیتی نہ بن جائے۔ یا اس صنف ادب کی حدود دوسری اصناف سے اس حد تک نہ مل جائیں کہ قاری کے لئے یہ تمیز کرنا دشوار ہو جائے کہ وہ ایک حقیقی خبر پڑھ رہا ہے یا کوئی تخیلاتی فن پارہ۔

آپ بیتی میں غیر ارادی طور پر قاری کی رہنمائی کا عنصر بھی ہوتا ہے یہاں پر بھی مصنف اپنی فنکارانہ صلاحیتوں سے کام لیتے ہوئے اپنے افکار و نظریات تجربات واحساسات کو دوسروں کے سامنے اس طرح پیش کرتا ہے کہ مصنف کی زندگی

---

[1] ریحانہ خانم ، " آپ بیتی کیا ہے " نقوش آپ بیتی نمبر 1964ء ، 100 واں شمارہ ، لاہور ادارہ فروغ اردو ، ص 89

کی روداد اپنے جملہ عیوب و محاسن اور تمام تر خوبصورتیوں اور بد صورتیوں کے ساتھ ہر ہر لفظ سے پوری توانائی کے ساتھ اپنے اپنے سچے پن اور کھرے لب و لہجے کے ساتھ ابھرنے لگتے ہیں ۔ اس کی شخصیت کے داخلی اور خارجی زمانوں میں نہ نظر آنے والے روابط واقعات کی سچائی کی روشنی میں رگوں میں دوڑتے ہوئے لہو کی طرح متحرک اور گرمجوشی کے ساتھ قاری کو محسوس ہونے لگتے ہیں ۔ اور مصنف کی ہر ہر واردات کا بلا کم و کاست اظہار اس کے بیان کو فن کے پیکر میں ڈھالتا چلا جاتا ہے جو ادب میں بذات خود ایک جدا حیثیت کی تخلیق ہے ۔

مغربی ادب میں آپ بیتی کی مختصر روایت -

اردو ادب کی بیشتر اصناف فارسی اور انگریزی ادب سے مستعار ہیں ۔ اس لئے ہمیں ان اصناف کی روایت لکھتے ہوئے انہیں فارسی اور انگریزی ادب میں بھی دیکھنا پڑتا ہے ۔ " آپ بیتی " بھی ایسی ہی صنف ہے جس نے انگریزی اور فارسی ادب میں پہلے آنکھ کھولی اور بعد میں اردو ادب کے دامن میں اپنے لئے جگہ بنائی ۔ چونکہ اس صنف کا تعلق انسان سے ہے اور انسان خود سے متعلق ہر اس چیز میں دلچسپی کا اظہار کرتا ہے جو اس کی معلومات میں اضافہ کرے ۔ آپ بیتی کی صنف ایک دم سے وجود میں نہیں آئی بلکہ ایک طویل تدریجی سفر طے کرتی ہوئی سوانح عمری تک پہنچی اور پھر اس میں تبدیلیوں اور نئے امکانات نے خود نوشت سوانح عمری کو وجود بخشا ۔

زندگی خواہ اپنی ہو یا کسی کی اس کی کہانی دوسروں کے ساتھ ساتھ خود ہمارے لئے بھی اہمیت کی حامل ہوتی ہے ۔ انسان کی فطرت ہے کہ وہ دوسروں کی غلطیوں سے سبق سیکھتا ہے اور خود بھی ٹھوکر کھا کر سیدھی راہ پر آتا ہے ۔ مختلف مذاہب کے مذہبی لٹریچر میں ہمیں اس کی ابتدائی صورتیں دکھائی دیتی ہیں ۔ عیسائیت میں مذہبی کتابیں اہم شخصیات کے حالات سے بھری پڑی ہیں ۔ صحائف میں بھی انسانوں کے حالات کا بیان ہے ۔ قرآن پاک میں بھی افـــراد اور اقوام کے حالات کو دوسروں کے لئے اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ وہ ہمارے لئے مشعل راہ ہیں ۔ Mrs Burr مسز بر اپنی کتاب Autobiography میں لکھتی ہیں ۔

" خود نوشت سوانح عمری کی تاریخ عیسائی عہد سے شروع ہوتی ہے گو مذہبی مصلحتیں ، مثلاً گوتم بدھ ، کنفیوشیس یا افلاطون کے ہاں چیدہ عبارتیں اور مذہبی رنگ کی داخلی کیفیات پائی جاتی ہیں اور سیزر کی Commentaries جو خارجی نوعیت کی ہونے کے باوجود آپ بیتی کی بہت بڑی محرک ثابت ہوتی ہیں موجود ہیں لیکن عیسیٰ سے پہلے کسی نے اس چیز کی طرف اشارہ نہیں کیا تھا ۔" سـہ[1]

سـہ[1] بحوالہ شاہ علی ۔ سید ۔ ڈاکٹر ، " اردو میں سوانح نگاری " گلڈ پبلشنگ ہاوس کراچی طبع اول 1961ء ، ص 65

ریحانہ خانم لکھتی ہیں -

" پہلے پہل خود نوشت سوانح اور تاریخ میں فرق نہیں کیا جاتا تھا - ہیرو لوٹس اور زنوفن وغیرہ کے کارناموں میں تاریخ اور خود نوشت سوانح کا امتزاج ملتا ہے - نفسیاتی اور اعترافی آپ بیتیاں رومن عہد سے لکھی جانی شروع ہوئیں - سینٹ اگسٹائن (354 - 431) کے روحانی تجربات کے نتیجے میں پہلی دفعہ نفسیاتی اور روحانی تجربات پر مبنی مذہبی مقصد کے تحت لکھے ہوئے اعترافات ملتے ہیں - سولہویں صدی عیسوی میں اٹلی کی دو خاص کتابیں قابل قدر ہیں جو سائنٹیفک اور فنکارانہ طور پر ذاتی تجزیے کا نمونہ ہیں - ایک جیسرم کارڈن فرنیشن کی تصنیف اور دوسری تصنیف Benevenuto Celling کی ہے انگریزی میں شروع شروع میں نظم میں آپ بیتیاں لکھی گئیں - (جیسے ہمارے ہاں دکن میں بعض مثنویاں) سترہویں صدی عیسوی میں انگریزی میں بہت زیادہ آپ بیتیاں لکھی گئیں مگر 1700ء سے پہلے بہت کم شائع ہوئیں - مارگریٹ کیولینڈش کی آپ بیتی اسی زمانے میں لکھی گئی - پروٹسٹنٹ مذہب کے روحانی محاسبے کے تحت بن یان اور بکسٹر کی مذہبی آپ بیتیاں ظہور میں آئیں - گویا اس فن کی سیج میں مذہبی آبیاری کو بھی دخل ہے - " [1]

---

[1] ریحانہ خانم ، " آپ بیتی کیا ہے " نقوش آپ بیتی نمبر لاہور ادارہ فروغ اردو ، جلد اول 1964ء ، ص 85

مغربی ادب کی تاریخ میں جھانکیں تو ہمیں یوں دکھائی دیتا ہے کہ آپ بیتی کی حقیقی صورت کے ابتدائی نقوش اٹھارویں صدی عیسوی میں دکھائی دیتے ہیں - ڈاکٹر صبیحہ انور کے تحقیقی مقالے "اردو میں خود نوشت سوانح حیات" کے مطابق انگریزی ادب میں Autobiography کی اصطلاح اٹھارویں صدی کے آخر میں استعمال کی گئی اور اس سے پہلے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ اصطلاح جرمن ادب میں مستعمل تھی - J.G. Herder جرمن شاعر نے اپنے مجموعے کے عنوان میں اس اصطلاح کو برتا - جو اس طرح ہے -

" Self biographics of famous men "

The great oxford Dictionary کے مطابق یورپ میں اس اصطلاح کو سب سے پہلے Robert Southey نے استعمال کیا - قدیم عہد میں ہمیں جو نقوش مغربی ادب میں ملتے ہیں ان میں Memoirs تذکرہ کی بہت اہمیت ہے - اس عہد میں مصنفین نے اپنے عہد کے حالات وواقعات کو ایک مورخ اور مبصر کی طرح پیش کیا - لیکن اپنی ذات کے اظہار کی ایک خوبصورت مثال St. Augustine 354 t 430 ہے - انسانی نفسیات سے متعلق ایک اہم آپ بیتی 76 - 1570 میں منظر عام پر آئی جسے کارڈن نے De vita prepria کے نام سے شائع کروایا -

Herodotus ہیرو ڈوٹس اور زنوفن Xeuphon کے ہاں ہمیں آپ بیتی اور خود نوشت کے عناصر ملے ہوئے دکھائی دیتے ہیں - سترھویں صدی میں انگریزی ادب میں کافی آپ بیتیاں لکھی گئیں لیکن 1700ھ سے پہلے بہت کم

آپ بیتیاں اشاعت پذیر ہوئیں - یورپ میں آپ بیتیاں نظم کی صورت میں بھی سامنے آئیں - اور اہم شخصیات کے Con fessions بھی منظر عام پر آئے -

اٹھارویں صدی عیسوی میں ناول اور آپ بیتی یکجا دکھائی دیتے ہیں لیکن انیسویں صدی میں یہ رنگ ختم ہوا اور ہمیں ہربرٹ سپنسر ، ٹرولوپ ، میڈن مالسٹائی ، چارلس ڈارون ، الفرڈ رسل ، کارلائل ، اور کارڈ نیل نیومین کی آپ بیتیاں دکھائی دیتی ہیں جو آپ بیتی کے فن کے قریب تر ہیں - اسی عہد میں ایڈ منڈ گوسن نے سوانح عمری اور خود نوشت سوانح عمری کو ملا دیا - اس کی مثال اس کی آپ بیتی Father and son ہے - اس عہد میں جان سٹوارٹ مل کی آپ بیتی میں اظہار ذات کے ساتھ ساتھ اس صدی کے انگریزی خیالات کا بیان بھی ملتا ہے-

گویا انیسویں صدی تک آتے آتے اس صنف میں بے شمار تبدیلیاں ہوئیں اور اپنے اس ارتقائی سفر کو طے کرتے ہوئے آپ بیتی نے باقاعدہ ایک صنف کا درجہ حاصل کرلیا اور اس میں ہمیں سائنسی انداز کی جھلک دکھائی دینے لگی - آپ بیتی ، کے جملہ پہلووں کے ساتھ ساتھ اس عہد میں اس کے تاریخی اور نفسیاتی پہلووں پر بھی توجہ دی جانے لگی - روسو کی "اعترافات" کو ایک رحجان ساز آپ بیتی کہا جاسکتا ہے جس میں مصنف کی سچائی اور بیباکی کی صفت اسے دوسری آپ بیتیوں میں ممتاز کرتی ہے - تھامس کوپر Thoms Cooper کی آپ بیتی

" The life of thoms cooper
written by himself "

Memoirs کو بھی انیسویں صدی کی بہترین آپ بیتیوں میں شمار کیا جاتا ہے ۔ تذکروں سرونسٹسن چرچل کی آپ بیتی اہم ہے برطانیہ کے اس مشہور ادیب اور وزیراعظم کے بعد بیشتر سپاہیوں نے اپنی ذات کی Projection کرتی ہوئی آپ بیتیاں تحریر کیں ۔

فارسی میں آپ بیتی کی مختصر روایت ۔

اردو ادب پر فارسی کے اثرات دور رس ثابت ہوتے ہیں ۔ اس لئے آپ بیتی کی اردو روایت پر نظر دوڑانے سے پہلے ایک مختصر جائزہ فارسی میں آپ بیتی بھی پیش کرنا ضروری ہے ۔ ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں ۔

" فارسی ادب میں زیادہ تو ایسی قسم کی کتابیں ہیں ۔ اس ادب کا کارآمد سوانحی حصہ دو شعبوں میں منقسم ہے : تذکرہ اور ذاتی ڈائریاں ، مثلاً مغل بادشاہوں کے روزنامچے اور تزکات ، تذکروں میں قیمتی سوانحی مواد موجود ہے ۔ لیکن وہ بذات خود مکمل سوانح عمری کے قائم مقام نہیں بن سکتے ۔ تذکرہ سوانح نگاری کے فن کی ایک شاخ ہے جس کو لغت اور سوانح کا مرکب قرار دیا جاسکتا ہے ۔ اس میں حالات و واقعات کچھ زیادہ نہیں ہوتے صرف چیدہ واقعات دیے دئیے جاتے ہیں اور سنین کا التزام بھی کم ہوتا ہے ۔ " [1]

---

[1] عبداللہ ۔ سید ۔ ڈاکٹر ، " وجہی سے عبدالحق تک " ص 121

مغرب میں لکھی گئی آپ بیتیاں مشرقی مزاج سے یکسر مختلف ہیں
اردو زبان میں آپ بیتی لکھنے سے قبل اس صنف کو فارسی میں رواج ملا۔ فارسی ادب میں اس صنف کو بادشاہوں نے زیادہ توجہ دی۔ بابر نے تزک بابری " لکھی تزک بابری کو شاہی آپ بیتیوں میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ اسے پڑھنے کے بعد قاری کو احساس ہوتا ہے کہ بابر فطرت انسانی کا بہت بڑا نباض تھا۔ تزک بابری کی تاریخی حیثیت مسلم ہے۔ بابر نے جن علاقوں میں قیام کیا۔ ان کے حالات کو ایک سیاح کی طرح بیان کیا۔ اور ان علاقوں کی اشیا ماحول اور افراد کو موضوع بنایا ہے۔

" یہ سمرقند جو ہمیں اللہ کی طرف سے عطا ہوا۔ اپنی خوبیوں اور لطائف کے اعتبار سے عالم میں انتخاب ہے۔ شہر کا نام سمرقند اور متعلقات کا عنوان ماوراالنہر ہے۔ یہ علاقہ حضرت عثمان غنی رض عہد میں فتح ہوا تھا اور یہاں کے لوگوں نے اسلام قبول کرلیا تھا۔ تابعین کرام میں سے حضرت خشم بن عباس نے سمرقند کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے نوازا تھا۔" ؎1

اس میں ہمیں علاقوں کی آب و ہوا، ماحول، نفسیات، خاندانی حالات و واقعات کے ساتھ ساتھ بابر کی شخصیت کے بارے میں اہم معلومات حاصل ہوتی ہیں کہ وہ ایک دل نواز بادشاہ تھا جو رعایا سے خاص نہ تھا۔ ترکی فارسی پر اسے

؎1 ظہیر الدین بابر، رشید اختر ندوی (مترجم) تزک بابری، لاہور سنگ میل پبلی کیشنز 1985ء، ص 35

کمال دسترس حاصل تھی وہ تیمور کی چھٹی پشت میں سے تھا اور اسے ورثے میں علم نوازی اور ادب پروری ، شجاعت ، حوصلہ مندی ، مستقل مزاجی کی صفات ملی تھیں - اس نے اپنی مادری زبان ترکی میں شعر کہے اور اپنا یہ روز نامچہ لکھا - تزک بابری پہلے ترکی میں لکھی گئی - اور پھر اکبر بادشاہ کے حکم سے اس کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا گیا - گو یہ تزک آپ بیتی کے فن پر پوری نہیں اتری لیکن یہ روز نامچہ آپ بیتی کے قریب تر ہے - اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے یہ تزک جو ترکی الاصل ہے اس کا فارسی کے ساتھ ساتھ انگریزی اور فرنچ زبان میں بھی تراجم ہوئے -

تزک جہانگیر -

شاہی اور فارسی زبان کی ایک اور اہم آپ بیتی " تزک جہانگیر " ہے جہانگیر نے اپنے اس روز نامچے میں ان واقعات کو سمویا ہے - جنہوں نے اس کی طبیعت پر گہرے اثرات مرتب کئے - جہانگیر نے جہاں اپنی صفات پر روشنی ڈالی ہے - وہاں اپنے عیبوں کی پردہ پوشی نہیں کی - فنون لطیفہ سے محبت اور رغبت - علم دوستی ، عدل و انصاف کے واقعات اس میں ہمیں جا بجا ملتے ہیں - اس ترک میں جہانگیر بادشاہ نے اپنے مشاہدات و تجربات ، نجی حالات ، ذوق کی تفصیلات فراہم کی ہیں -

بادشاہوں میں امیر تیمور کے ملفوظات " ترک تیموری " اہم ہیں یہ ترکی الاصل تھے ابو طالب حسن نے عہد شاہجہان میں ان کا ترجمہ کیا - لیکن

اس کی حیثیت مشکوک ہے گو کہ اس میں صیغہ واحد متکلم " میں " استعمال کیا گیا ہے لیکن اس میں امیر تیمور کی زندگی کے آخری لمحات تک کا ذکر ملتا ہے جس سے ایسے لگتا ہے جیسے یہ تصنیف ان کے علاوہ کسی اور نے مکمل کی ہے -

ان کے علاوہ شیخ علی حزیں کی آپ بیتی کا ترجمہ ایف سی بالفور نے انگریزی زبان میں کیا - ان کے علاوہ میر تقی میر کی " ذکر میر " بھی فارسی زبان میں لکھی گئی - آنند رام مخلص کا تذکرہ و سفر نامہ بھی آپ بیتی کے قریب تر ہے - حضرت داتا گنج بخش کی تصنیف " کشف المحجوب " میں بھی آپ بیتی سے متعلق تحریریں ملتی ہیں -

اردو ادب میں آپ بیتی کی روایت "

اردو ادب کا دامن آپ بیتی سے خالی نہیں اس میں بھی بلند پایہ آپ بیتیاں ملتی ہیں - گو مکمل آپ بیتی سے قبل ادب میں ملفوظات و مکتوبات ، سفر ناموں ، روز نامچوں میں آپ بیتی کے کچھ عناصر دکھائی دیتے ہیں - ان کے علاوہ آپ بیتی کے طور پر چند جزوی آپ بیتیاں منظر عام پر آئیں اور پھر کچھ مکمل آپ بیتیاں بھی لکھی جانے لگیں - جزوی آپ بیتی سے مراد وہ آپ بیتی ہے جو زندگی کے کسی مختصر عرصے پر محیط ہو - گو آپ بیتی میں ساری زندگی کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا لیکن اپنی زندگی کے ایک بڑے حصے کا احاطہ کرنے والی آپ بیتی کو مکمل آپ بیتی کیا جاسکتا ہے - جس میں انسان کے ذہنی و فکری ارتقا ، میلانات رجحانات اور نظریات کا احاطہ ہو -

اردو ادب میں خود نوشت سوانح نگاری کو 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد رواج ملا ۔ 1857ء کا زمانہ غلامی کا زمانہ تھا جس میں برصغیر کے عوام کا رہن سہن بدل کر رہ گیا تھا ۔ حاکم محکوم بن چکے تھے ۔ اور ہندوستان میں ہندوستانیوں کے بجائے انگریزوں کی حکومت قائم ہوگئی تھی ۔ اس عہد میں برصغیر کے باشندے بے معنی اور بے قراری کی زندگی گذار رہے تھے ۔ انگریزوں نے مظالم کے پہاڑ ان پر توڑ ڈالے تھے جنہیں اہل ہند نے اپنی زندگی کے اس عہد کو آپ بیتی کی صورت میں لکھ ڈالا ۔

ایک سطح پر دیکھا جائے تو آپ بیتی لکھنے سے ، آپ بیتی لکھنے والے اور پڑھنے والے دونوں کا کتھارسس ہو جاتا ہے ۔

اردو جامع انسائیکلو پیڈیا کے مطابق

" خود نوشت سوانح عمری یورپ میں روسو کے " اعترافات " اس میں انقلابی کتاب ہے ۔ اگرچہ اس سے پہلے سینٹ آگسٹائن کے " اعترافات " سے اس کی ابتدا ہو چکی تھی ۔ بعد میں ایک دور ایسا آیا کہ بعض اہم سیاسی شخصیتوں ، مثلاً ہٹلر اور مسولینی نے اسے ذاتی پروپیگنڈہ کا ذریعہ بنالیا ۔ مشرقی ممالک کی ادبیات میں آپ بیتی کا رواج عہد قدیم سے چلا آرہا ہے ۔ برصغیر پاک و ہند میں مغل سلاطین نے ابتدائی طور اس پر توجہ کی ۔ اس سلسلے میں تزک بابری اور تزک جہانگیری خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ ٹیگور ، گاندھی جی

اور پنڈت جواہر لال نہرو کی آپ بیتیاں بھی ایک خاص مقام رکھتی ہیں ۔" [1]

برصغیر پاک و ہند میں دکن میں گولکنڈا ، بیجا پور کے والیان کی ادبی سرپرستی میں بہت سی مثنویاں اور دیگر اصناف میں بھی آپ بیتی کے ابتدائی نقوش دکھائی دیتے ہیں ۔ مثلاً " توصیف نامہ " از فیروز 957ھ سے 988ھ اسے اردو کی قدیم منظوم سوانح عمری قرار دیا جاسکتا ہے ۔ " محی الدین نامہ " از فضل 1050ھ کے بعد " غوث نامہ " از سید شاہ حسین ذوقی ، " محبوب القلوب " از باقر آگاہ 1207ھ ۔ " اسرار عشق " از مومن 1093ھ " فیض عام قدس " 1125ھ مترجمہ سید شہاب الدین ۔ " ابراہیم نامہ " از عبدل 1010ھ " قطب مشتری " 1018ھ از وجہی ، 1059ھ میں " خاور نامہ " از ابن حسام میر حسن کی " سحرالبیان " ، دیا شنکر نسیم کی گلزار نسیم ، نظامی کا " سکندر نامہ " جامی کی " یوسف زلیخا " ۔

ان کے علاوہ " الہقا المنن ، 1885ء از مولانا محمد جعفر تھانیسری " آپ بیتی " 1886ء از عبدالغفور نساح ، " کالا پانی " بھائی پرمانند ، " رسالہ سوانح عمری " 1889ء ، مولوی عبدالرحمن ، ایک " نادر روزنامچہ ، 1894ء مولوی مظہر علی سندیلوی ، " داستان غدر " 1911ء سید ظہیر الدین دہلوی ، " ایام غدر " 1912ء منشی محمد عنایت حسین خان ، " تذکرہ "

---

[1] اردو جامع انسائیکلو پیڈیا ۔ جلد دوم ۔ لاہور
شیخ غلام علی اینڈ سنز ۔ 1968ء ، ص 5

1919ء ، مولانا ابوالکلام آزاد " آپ بیتی " 1921ء ، خواجہ حسن نظامی ، " حزن اختر " 1922ء ، واجد علی شاہ اختر " پری خانہ " از واجد علی شاہ 1926ء ، " عشق نامہ ، از واجد علی شاہ 1926ء ، " تذکرہ وحیدی 1925ء از مولانا وحیدالزماں ، " کارنامہ سروری " 1933ء از نواب آغا مرزا سرور جنگ " محل خانہ شاہی " 1926ء ، از فدا علی خنجر ، " تلاش حق " ترجمہ 1935ء از موہن داس کرم چند گاندھی - " میری کہانی " ترجمہ 1936ء از پنڈت جواہر لال نہرو " قید یاغستان " 1937ء از محمد اکرم صدیقی ، " میرا افسانہ " 1940ء چوہدری افضل حق " میری کہانی میری زبانی " 1939ء از سید ہمایوں مرزا - " ایک معلم کی آپ بیتی " از عبدالغفار مرحولی 1940ء - " اعمال نامہ " از سر سید رضا علی 1943ء " خون بہا " از حکیم احمد شجاع 1943ء - " مابدولت " 1946ء از شوکت تھانوی -

فارسی ادب میں زیادہ تر آپ بیتیاں بادشاہوں نے لکھیں - ان آپ بیتی لکھنے والوں میں ادبا بہت کم ہیں - بادشاہوں نے اپنے ان روزنامچوں میں زیادہ تر اپنے سوانحی حالات کو قلمبند کیا ہے - ان روز نامچوں میں ہمیں ان کے عہد کی تہذیب و معاشرت اور زندگی کی چہل پہل کے مرقعے ملتے ہیں - ان کے علاوہ میر کی ذکر میر ، ملفوظات فارسی زبان میں لکھے گئے - صوفیا کے ملفوظات مکتوبات ، مثنویوں اور روز نامچوں میں بھی سوانحی حالات کو قلمبند کیا گیا ہے - ان سب تحریروں میں غالب پہلو تاریخی دکھائی دیتا ہے - بادشاہوں نے اپنے خارجی واقعات کو بہت تفصیل سے بیان کیا ہے جبکہ داخلی مشاہدات کی عکاسی

مزید تفصیل کی متقاضی دکھائی دیتی ہے ۔ اردو زبان چونکہ فارسی زبان کے قریب تر ہے اس لئے جب اردو زبان میں آپ بیتیاں لکھنے کا رواج عام ہوا تو ہمارے ہاں لکھی جانے والی خود نوشت سوانح عمری میں بھی تاریخی پہلو کو زیادہ اہمیت دی گئی ۔

اس کی بڑی وجہ فارسی زبان کے اثر کے ساتھ ساتھ 1857ء کی جنگ آزادی بھی ہے ۔ 1857ء کے بعد سر سید احمد خان نے مغربی علوم سے متاثر ہو کر مقصدیت کے تحت ایک نئی سوچ پیدا کی ۔ ان کے ساتھیوں میں حالی ، شبلی ، نذیر احمد ، ذکاء اللہ ۔ چراغ علی اور محسن الملک نے ان کا بڑھ چڑھ کر ساتھ دیا ۔ تحریک علی گڑھ نے جہاں علم و ادب میں اور بہت سی اصناف کو متارف کروایا ان میں سے ایک سوانح عمری بھی ہے ۔ حالی اور شبلی نے سوانح عمری کی صنف کو فروغ دیا ۔ حالی کی سوانح عمریوں میں مغربی اصولوں کی کارفرمائی دکھائی دیتی ہے ۔ 1857ء کی جنگ آزادی نے برصغیر کے رہنے والوں پر گہرے اثرات مرتب کئے ۔ یہ دور ایسا دور تھا جس میں حاکم محکوم بن گئے اور باہر سے آنے والوں نے برصغیر میں اپنی حکومت کے جھنڈے گاڑ دیئے ۔ آزادی کی راہ کے سپاہیوں کو ہر طرح سے اذیت دی جانے لگی ۔ لوگوں نے مال و دولت جان و عزت کی قربانیاں دیں ۔ انگریزوں کے مظالم کو برداشت کیا اور پھر اپنی داستان حیات کو خود نوشت کی صورت میں رقم کر کے پیش کیا ۔ یوں خود نوشت سوانح عمری میں تاریخی رنگ چھایا دکھائی دینے لگا ۔

اردو ادب میں لکھی جانے والی ان اہم آپ بیتیوں کے مختصر سے جائزے کے بعد ذہن میں ایک سوال ابھرتا ہے کہ آیا ان میں سب سے پہلی آپ بیتی کون سی ہے ۔ گو کہ آپ بیتی کے جزو ہمیں اس عہد کے خطوط اور روزنامچوں وغیرہ میں بھی ملتے ہیں ۔ مگر باقاعدہ خود نوشت سوانح عمری کے اپنے تقاضے ہیں جنہیں یہ تحریریں کلی طور پر پورا کرنے سے قاصر ہیں ۔ مختلف محققین نے اس سوال پر غور کیا ہے ۔ الطاف فاطمہ کے خیال میں سر سید رضا علی کا "اعمالنامہ" اردو کی پہلی مستقل آپ بیتی ہے ۔ ریحانہ خانم ، مولانا جعفر تھانیسری کی "کالا پانی" المعروف "تواریخ عجیب" کو اردو کی پہلی آپ بیتی قرار دیتی ہیں ۔ عبدالمجید قریشی کے نزدیک "نواب صدیق حسن خان کی "البقا المنن بالقا المحن" کو اولیت حاصل ہے ۔ جبکہ مولانا علم الدین سالک "کالا پانی" کو ہی پہلی آپ بیتی کہتے ہیں ۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے بھی اردو کی خود نوشت سوانح عمری کے تجزیے میں "کالا پانی" کے سر ہی اولیت کا سہرا باندھا ہے ۔ ڈاکٹر محمد صادق ، سر سید رضا علی کی آپ بیتی "اعمالنامہ" کو اولین آپ بیتی قرار دیتے ہیں ۔ گویا تحقیق کے مطابق یہ بات قرین قیاس ہے کہ مولوی صدیق حسین خان کی آپ بیتی "البقا المنن بالقالمحن" کا سن اشاعت 1885ء ہے ۔ جبکہ مولانا جعفر تھانیسری کی "تواریخ عجیب" کا سال اشاعت 1886ء ہے ۔

عبد المجید قریشی لکھتے ہیں ۔

" نواب صدیق حسن خان کی آپ بیتی کے بعد مولانا محمد جعفر تھانیسری کی مشہور و معروف آپ بیتی " کالا پانی " شائع ہوئی"۔ [1]

" کالا پانی " مولانا محمد جعفر تھانیسری کی زندگی کے بڑے حصے پر محیط ہے اس میں انہوں نے وطن سے محبت کے جرم میں جو ایام کالے پانی کی سزا کے طور پر جزیرہ انڈیمان میں گذارے انہیں قلمبند کیا ہے - اپنی زندگی کے اس طویل اور اہم عرصے کی تصویر کشی اس طرح سے کی ہے کہ قاری تمام حقائق ، و واقعات سے آشنا ہونے کے ساتھ ساتھ عظمت انسانی کا معترف بھی ہوجاتا ہے - وہ لکھتے ہیں -

" واقعہ 8 دسمبر 1865ء بہ سواری جہاز جمنا ہم بمبئی سے کالے پانی کو روانہ ہوئے ------- مہینہ بھر دو وقتہ چاول کھانے سے بڑی تکلیف ہوئی جب جہاز سمندر میں پہنچا تو طوفان اور تلاطم سے ملتا تھا - اکثر آدمی قے متلی سے بیمار ہوگئے - ایک پنجابی قیدی میعادی ہفت سالہ جس کے صرف پانچ برس اس وقت باقی رہ گئے تھے بیمار ہوکر جہاز پر مر گیا - ہم لوگوں نے موافق قاعدہ شریعت کے اس کو غسل اور کفن دے کر اور نماز جنازہ پڑھ کر اس کی لاش کے ساتھ بہت سے پتھر باندھ کر سمندر میں چھوڑ دیا -" [2]

---

[1] عبدالمجید قریشی "آپ بیتی اردو ادب میں" سہ ماہی الزبیر - آپ بیتی نمبر 1964ء ، بہاولپور اردو اکیڈمی ، ص 32

[2] مولانا محمد جعفر تھانیسری ، "کالا پانی" لاہور سنگ میل پبلی کیشنز 1972ء ، ص 62 ، 63

اردو ادب میں لکھی جانے والی اہم آپ بیتیوں میں سید ظہیر الدین ظہیر دہلوی کی " داستان غدر " میں انہوں نے غدر کے زمانے کے مصائب آرام واقعات کو موضوع بنایا ہے ۔ اس میں ان کی زندگی کے حالات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اسے ہم اردو ادب کی مکمل آپ بیتی کے ذیل میں رکھ سکتے ہیں ۔ اس میں مدت العمر کے واقعات اس طرح سے بیان کئے گئے ہیں کہ ان میں سے غیر ضروری تفاصیل پر روشنی نہیں ڈالی گئی ۔

" سر گذشت ایام غدر " از خان بہادر منشی محمد عنایت حسین رسالۃ" الناظر" میں جولائی 1936ء سے دسمبر 1936ء میں شائع ہوئی اور بعد میں اسے کتابی شکل میں شائع کیا گیا ۔ اسے مکمل آپ بیتی نہیں کہا جاسکتا البتہ جزوی آپ بیتی کہا جاسکتا ہے ۔ چونکہ اس میں مصنف کی زندگی کے چند اہم اور خاص حالات و واقعات دکھائی دیتے ہیں اور یہ زندگی کے بڑے حصے کا احاطہ نہیں کرتی ۔

مولانا فضل الحسن حسرت موہانی کی " قید فرنگ " ان کی زندگی کے ان دو سالوں کی مکمل داستان ہے جو انہوں نے انگریزوں کی قید میں گذارے ۔ قید فرنگ کا ناشر لکھتا ہے ۔

" یہ کتاب ایک عرصہ سے ناپید تھی اور ہم اسے پاک و ہند میں پہلی بار نئی ترتیب و تزئین اور اضافے کے ساتھ پیش کر رہے ہیں تاکہ ہماری نئی نسلیں ان تکلیفوں ، قربانیوں اور کٹھن راہوں کا

اندازہ کر سکیں جن سے گذر کر آزادی کی منزل تک پہنچنا ممکن

ہوا اور جس کی بدولت انہوں نے ایک آزاد ماحول اور ایک آزاد

معاشرے میں جنم لیا ۔ اور وہ ایک بہتر مستقبل کے حصول کے

لئے اس سے سبق لے کر اپنے کردار کی تعمیر کر سکیں ۔ " [1]

مولانا ابوالکلام آزاد کی تصنیف " تذکرہ " جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہے

اس میں موصوف نے اپنی داستان حیات کو قلمبند کرنے کی بجائے قارئین کے سامنے

اپنے آباء اجداد کے قصے بیان کئے ہیں ۔ یہ تصنیف بھی آپ بیتی کے فن پر

پوری نہیں اترتی ۔

" آپ بیتی " از خواجہ حسن نظامی ، روسو کی " اعترافات " کے

قدرے قریب تر ہے ۔ اس میں انہوں نے اپنے تجربات و مشاہدات کو پیش کیا

ہے لیکن اس میں انہوں نے ہر واقعے سے اسباق اخذ کرکے اس کی فضا کو

بوجھل بنا دیا ہے ۔ لیکن اس کے باوجود حقائق کے بیان کی وجہ سے اسے ادب

میں اہم مرتبہ حاصل ہے ۔

" میری کہانی میری زبانی " از سید ہمایوں مرزا "

اسے خود نوشت سوانح عمریوں میں اہمیت حاصل ہے جس کی بڑی وجہ یہ ہے

کہ مصنف نے اس میں اپنی زندگی کے سفر کو بچپن سے لے کر موت سے کچھ عرصہ

---

[1] حسرت موہانی ، "قید فرنگ " کراچی ، مکتبہ نیا راہی ۔
بار اول اگست 1918ء ، ص 9

قبل تک درج کیا ہے ۔

" اعمال نامہ " از سر سید رضا علی ۔ چونکہ اس تصنیف کے مصنف کا زیادہ تعلق سیاست سے رہا ہے اس لئیے اس میں ہمیں ان کے ذاتی حالات کے ساتھ ساتھ سیاسی صورت حال کے متعلق بھی معلومات ملتی ہیں ۔

" خون بہا " از حکیم احمد شجاع اس آپ بیتی کو مکمل آپ بیتی قرار نہیں دیا جاسکتا کیونکہ یہ تحریر مصنف کی زندگی کا کچھ حصہ ہمارے سامنے لاتی ہے اس تحریر سے ہمیں سوانحی مواد ملتا ہے لیکن اس تحریر کو تاثرات کا مجموعہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا ۔

1857ء کی جنگ آزادی کے بعد ہماری سیاسی سماجی معاشی ، معاشرتی اور ادبی تاریخ کا رخ مڑ گیا ۔ جنگ آزادی کے ان واقعات نے لوگوں کو بے حد حساس بنا دیا ۔ ان حالات میں لوگوں نے اپنے شدت غم کو کم کرنے اور زندگی کا رخ موڑ دینے والے واقعات کو اپنی ڈائریوں روز نامچوں اور خطوط میں جگہ دینی شروع کردی ۔ گویا 1857ء کے واقعات اردو آپ بیتیوں کا پس منظر ہیں ۔

اردو ادب میں انسانی زندگی کی ارزانی اور دہشت و خوف کی منظر کشی کا دوسرا باقاعدہ دور 1947ء سے شروع ہوتا ہے ۔ 1947ء کے بعد جو آپ بیتیاں منظر عام پر آئیں ان میں ہیئت اور طریق کار کے حوالے سے بے حد واضح فرق نظر آتا ہے چونکہ ہر شخص کو پیش آنے والے واقعات کی نوعیت

مختلف ہوتی ہے اور مختلف نوعیت کے انسانوں پر ان کے مختلف قسم کے اثرات مرتب ہوتے ہیں یوں اختلاف رائے کی گنجائش نکل آتی ہے ۔

ہمارے ہاں ایک رحجان یہ بھی پایا جاتا ہے کہ نئے لکھنے والے پہلے لکھنے والوں کی آپ بیتیوں سے استفادہ نہیں کرتے - جس کی وجہ سے فنی لحاظ سے ہر کتاب دوسرے سے مختلف دکھائی دیتی ہے - اردو ادب میں مستقل حیثیت کی آپ بیتیوں کی تعداد کم ہے لیکن ان کے علاوہ بھی دیگر آپ بیتیوں میں بعض اجزاء حوصلہ افزا اور قابل قدر ہیں -

آزادی کے بعد لکھی جانے والی اہم آپ بیتیاں "

1947ء کے بعد آپ بیتی لکھنے کا انداز قدرے بدل گیا اس عہد میں لکھی جانے والی آپ بیتیوں میں مصنفین نے گذرے ہوئے دنوں کو آواز دی -

" سرگذشت " از عبد المجید سالک میں ہمیں مصنف کی صحافتی زندگی اور سیاست کی کہانی بکھری ہوئی دکھائی دیتی ہے انہوں نے اپنی ذات کے حوالے سے لاہور کی پوری تہذیب کی عکاسی کی ہے - ان کا طرز تحریر ایسا ہے کہ وہ واقعات کو مورخ کی طرح حالات کو صحافی کے انداز سے اور شخصیات کو خاکہ نگار کی نظر سے بیان کرتے ہیں -

" سرگذشت " کا مقدمہ لکھتے ہوئے چراغ حسن حسرت تحریر کرتے ہیں "

" سالک صاحب کا انداز تحریر آورد اور تصنع سے پاک اور بڑا
سادہ و بے تکلف ہے - اور یہی سادگی و بے تکلفی ان کی تحریر
کا زیور ہے - یوں کہنا چاہیے کہ آب صافی کا ایک چشمہ ہے جو
اپنی رو میں بہتا چلا جاتا ہے - نکتہ طرازی ان کی طبیعت کا
خاص جوہر ہے -" سہ[1]

خود مصنف لکھتے ہیں -

" خاتمہ سخن ! آج سرگذشت ختم ہوتی ہے - 15 اگست کو
پاکستان قائم ہوگیا - اس وقت کے بعد کی سرگذشت لکھنا بے حد
دشوار ہے - میں ابھی اپنے دل و دماغ اور اپنے قلم میں اتنی صلاحیت
نہیں پاتا کہ جو کچھ میں نے دیکھا اور سنا اور بساط سیاست پر
شاطرین نے جو چالیں چلیں ان کو قلمبند کر سکوں - اور شاید اس
سرگذشت کو خاص انداز سے لکھنا مصلحت بھی نہیں اگر چند
سال حیات مستعار باقی ہے تو انشاء اللہ سرگذشت کا دوسرا
حصہ بھی مرتب ہوگا -" سہ[2]

" نقش حیات " از سید حسین احمد مدنی یہ آپ بیتی مصنف کی
زندگی کو سمیٹے ہوئے ہے اس میں ان کے حالات ان پر بیتنے والی کیفیات ان

سہ[1] عبدالمجید سالک ، " سرگذشت " لاہور قومی کتب خانہ
بار اول 1955ء ، ص 7

سہ[2] ایضاً ص 534 ، 535

کی مذہبی زندگی اور ہجرت کا بیان ملتا ہے شروع میں یہ تصنیف فن آپ بیتی پر پوری اترتی ہے مگر بعد میں اس میں جگ بیتی کا سا انداز دکھائی دیتا ہے۔

" ناقابل فراموش " از دیوان مفتون سنگھ کو آپ بیتی کی بجائے غیر مربوط واقعات کا مجموعہ کہنا زیادہ مناسب ہے ۔ یہ آپ بیتی ہندوستانی ریاستوں کی ریشہ دوانیوں کا دستاویزی ثبوت فراہم کرتی ہے ۔ اسے مکمل آپ بیتی کی ذیل میں نہیں رکھا جاسکتا ۔ اس میں ذاتی بیان سے زیادہ حالات و واقعات پر توجہ دی گئی ہے ۔

" یادوں کی برات " از جوش ملیح آبادی ۔ اس آپ بیتی کو اردو ادب میں خاص مقام حاصل ہے ۔ چونکہ اس میں مصنف نے مشرقی انداز سے ہٹ کر مغربی انداز میں اپنی داستان حیات کو بیان کیا ہے ۔ ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں ۔

" اس کتاب میں حالات زندگی کا جزر و مد دیدنی بھی ہے اور شنیدنی بھی اور ان سے جوش کی خود مرکزیت زیادہ نمایاں ہے ۔ لیکن بعض مقامات پر مشرقی اقدار کو ٹھیس لگتی ہے تو جوش کی جمال پسندی پر بھی ضرب پڑجاتی ہے ۔" [1]

جہان دانش از احسان دانش ۔ یہ آپ بیتی دیگر آپ بیتیوں سے مختلف ہے اس میں مصنف نے اپنی ذات کو اس طرح سے بیان کیا ہے کہ

---

[1] انور سدید ڈاکٹر ، " اردو ادب کی مختصر تاریخ "
اسلام آباد ، مقتدرہ قومی زبان 1991ء ، ص 617

مال و دولت اور جاہ و جلال کے بغیر مصنف کی مشقت اور علم دوستی انہیں عظیم انسان کے روپ میں پیش کرتی ہے - مصنف نے اپنی زندگی کے طویل اور صبر آزما دور کی عکاسی اس طرح کی ہے کہ ان کی شخصیت عظمت انسانی کا مرقع بن جاتی ہے - اس آپ بیتی میں نفی ذات کے عناصر اور محنت ، عسرت کے دنوں کی مشقت انسانی محنت دیانت اور توکل کی صفات پائی جاتی ہیں - ان اہم آپ بیتیوں کے علاوہ ذوالفقار علی بخاری کی " سرگذشت " ڈاکٹر غلام جیلانی برق کی " میری داستان حیات " شورش کاشمیری کی " نامہ دل دور چراغ محفل " افضل حق کی " میرا افسانہ " سر ظفراللہ خان کی " تحدیث نعمت " ، اختر حسین رائے پوری کی " گرد راہ " میرزا ادیب کی " مٹی کا دیا " صادق الخیری کی " میری زندگی فسانہ " ڈاکٹر عبد السلام خورشید کی " رو میں ہے رخش عمر " ، یوسف حسین خان کی " یادوں کی دنیا " عشرت رحمانی کی ، عشرت فانی " کرنل غلام سرور کی " آئینہ ایام " رشید احمد صدیقی کی " آشفتہ بیانی میری " اور وزیر آغا کی " شام کی منڈیر سے " اہم ہیں -

رسالہ افکار کراچی نے چند ممتاز ادیبوں کو اپنی خود نوشت سوانح عمری لکھنے پر آمادہ کیا جس کے نتیجے میں ڈاکٹر سید عبداللہ ، ڈاکٹر عبادت بریلوی ، محمد احمد سبزواری ، شان الحق حقی ، مجنوں گورکھپوری قدس صہبائی ، اور محمد یونس احمر کی آپ بیتیاں منظر عام پر آئیں -

اس گفتگو کو ختم کرتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ " آپ بیتی " لکھنے کا باقاعدہ آغاز انگریزی ادب میں اردو ادب سے بہت پہلے ہوا۔ اردو ادب میں آپ بیتی لکھنے کا رواج شروع میں فارسی زبان میں لکھی جانے والی عبوری آپ بیتیوں کے بعد پڑا اور منظوم آپ بیتیوں نے نثری آپ بیتی کو جنم دیا پھر عہد بہ عہد یہ مشق باقاعدہ ادبی صنف کے طور پر اردو ادب میں در آئی۔ " کالا پانی " از جعفر تھانیسری سے لے کر شام کی منڈیر سے " از وزیر آغا تک اردو آپ بیتی موضوعاتی اور ترکیبی ہر دو تخلیقی پہلوؤں سے متنوع رہی ہے۔

*****

باب سوم

احسان دانش سوانحی خاکہ اور تصانیف

باب سوم

" احسان دانش سوانحی خاکہ اور تصانیف "

احسان دانش کا حقیقی نام احسان الحق تھا - وہ احسان تخلص کرتے تھے - والد کا نام قاضی دانش علی تھا - اسی نسبت سے وہ اپنا نام احسان دانش لکھتے تھے - ان کا شجرہ نسب شیخ حسن زنجانی سے ملتا ہے - اور شیخ حسن زنجانی کا سلسلہ نسب حضرت ابو بکر صدیق رضؓ تک جا پہنچتا ہے - اسی حسب نسب کی وجہ سے وہ شیخ صدیقی ہیں - احسان دانش 1914ء میں " کاندھلہ " ضلع مظفر نگر یوپی میں پیدا ہوئے - ان کے محلے کا نام " مولا نان " تھا - احسان دانش کے والد قاضی دانش علی کا وطن قصبہ " باغپت " ضلع میرٹھ تھا - جو دریائے جمنا کے کنارے آباد ہے " جہان دانش " میں احسان دانش لکھتے ہیں -

> " اگرچہ قضا ہمارا جدی طرہ امتیاز نہ تھا - لیکن میرے والد کا تعلیم میں خام رہ جانا بتاتا ہے کہ خاندانی طور پر تو پشتوں سے یہ انحطاط شروع ہوچکا تھا - جس کا شباب مجھے نصیب ہوا - سنا جاتا ہے کہ میرے والد کے پاس اچھی خاصی جائداد تھی لیکن یہ معلوم نہ ہوسکا کہ کہــــاں

گئی اور کیونکر گئی ۔" [1]

احسان نے قصبہ کاندھلہ میں آنکھ کھولی اور اپنے نانا ابو علی شاہ کے یہاں پروان چڑھے ۔ نانا پیشے کے اعتبار سے غریب سپاہی تھے ۔ ان کے انتقال پر قاضی دانش علی بھی باغپت سے کاندھلہ آگئے ۔ اور شہر جمن مشرقی میں ٹھیکیداروں کے یہاں مزدوروں کے جماعت دار تھے ۔ اور جب جماعت داری نہ ملتی تو وہ بھی مزدوری کرتے ۔

احسان دانش نے زندگی کی عریاں حقیقتوں کو بچپن میں ہی دیکھ لیا تھا ۔ بہت ممکن تھا ، کہ وہ افلاس اور غربت جس کے سبب ان کی بے شمار خواہشات پیدا ہونے سے پہلے ہی مر جاتی تھیں ، انہیں ایک منفی سوچ والا شخص بنا دیتیں ۔ لیکن والدہ کی شفیق گود اور تربیت نے ان کے اندر ایک ایسا عزم پیدا کیا کہ وہ منفی سے زیادہ مثبت سوچ کے مالک بن گئے ۔ لکھتے ہیں ۔

" قرائن ماحول سے پتا چلتا ہے کہ میرے نانا جان بھی بمشکل اپنے خاندان کا گذارا کرتے ہوں گے ۔ کیونکہ جس مکان میں ، میں نے ہوش سنبھالا، تھا تو شاہانہ طرز و طریق کا لیکن اس قدر قدر کہنہ اور بوسیدہ کہ جس بالائی حصے میں ہم رہتے تھے آئے دن اس کی چھت میں سانپ رینگتے دکھائی دیا کرتے ۔ گھر

---

[1] احسان دانش ، " جہان دانش " لاہور القائم آرٹ پریس سن طباعت 1975ء ، ص 24

میں لکڑی لوہے یا جست کا کوئی بکس نہ تھا ۔ نئے اور دھلے
ہوئے کپڑے ایک مشکے میں بھرے رہتے اور عید تہوار کو میری
والدہ وہی ملے دلے کپڑے سلوٹیں کھول کھول کر مجھے پہنایا
کرتی ۔ " [1]

احسان دانش کی والدہ ایک جفاکش گھریلو خاتون تھیں ۔ جو معاشی خلا کو پر کرنے کے لئے محلے کے کپڑے سلائی کرتیں اور اناج پیستیں ۔ معاشی بدحالی اور جانگداز محنت کے باوجود وہ اپنے بیٹے کی تربیت سے غافل نہیں تھیں اسی ماحول میں انہوں نے اپنی والدہ سے سو تک گنتی یاد کی ۔ اپنے بچے کو وہ بھی اچھا کھلانا اور اچھا پہنانا چاہتی تھی لیکن تنگدستی اس کی اجازت نہ دیتی ۔ وہ ان حالات پر اندر ہی اندر کڑھتی تھیں ۔ لیکن بچے کی دلداری اس طرح کرتیں کہ بچہ ممتا کی پھوار میں بھیگ جاتا ۔

" جب سالن نہ پکتا تو والدہ مجھے پانی میں بھگو کر روٹی کھلاتیں
اور ساتھ ہی خود بھی کھاتیں ۔ ۔۔۔ اگرچہ مجھے کھانا کھلاتے
وقت وہ بڑی ہنسی خوشی کی باتیں کرتیں ۔ مگر ان کے کڑھنے کا
اندازہ اس وقت ہوتا جب کھانے کے بعد کہیں سے سلائی یا پسائی
کے پیسے آجاتے ۔ اس وقت وہ بری طرح ململاتیں اور کہتیں
کہ " بہن اگر ذرا سی دیر پہلے آجاتیں تو کیا ہوجاتا ؟

---

[1] احسان دانش ، " جہان دانش " لاہور القائم آرٹ پریس
1975ء ، ص 25

میرے بچے نے نمک کے پانی سے روٹی کھائی ہے ۔" [1]

گویا احسان دانش نے ماں کی شفیق گود سے محبت کا جذبہ حاصل کیا اور والد کی خوش مزاجی اور درویش صفتی سے ان صفات سے مزین ہوئے ۔ ان کے صبر آزما حالات نے ان کو بے حد حساس اور صابر بنا دیا تھا ۔ گویا ان کی شخصیت کی اولین تعمیر میں والدین کی عمدہ پرورش اور حالات کا بہت ہاتھ ہے ۔ ان کی ذہنی تربیت میں والدین کے ساتھ ساتھ ماحول کا بھی بہت حصہ ہے ۔ وہ جہان دانش میں لکھتے ہیں ۔

" میری عمر کی باولی گہری ضرور ہے لیکن اندھیری نہیں ۔ جب میں اس میں جھانکتا ہوں تو چاروں طرف طاقوں میں چراغ جل اٹھتے ہیں اور سیڑھیاں اس قدر روشن ہو جاتی ہیں کہ دوزیں تک نظر آنے لگتی ہیں ۔ مجھے میرے ماضی نے اس قدر کھنڈلا ہے کہ کہیں تو پتھنیاں کھا کھا کر میرا بدن نیلا پڑ گیا اور کہیں چوشل جگہیں اپنی سطح سے ابھری کی ابھری رہ گئی ہیں ۔ مگر نظر میں تہ رسی آگئی ۔" [2]

---

[1] جہان دانش ص 27

[2] احسان دانش ، " دیباچۂ حیات " جہان دانش ، ص 11

گو والدین کے مالی حالات اچھے نہ تھے لیکن ان کا ارادہ بلند تھا وہ چاہتے تھے کہ احسان تعلیم حاصل کریں لیکن افلاس نے اس ارادے کو بے بس کردیا - انہوں نے سید حافظ محمد مصطفیٰ سے قرآن خوانی سیکھی اور بہت جلد نماز روزے کے پابند ہوگئے - انہوں نے جماعت چہارم تک باقاعدہ مدرسے میں تعلیم حاصل کی - وہ لکھتے ہیں -

" جب میں تیسری جماعت کے امتحان میں کامیاب ہوا اور اپنی کامیابی کی خبر گھر جاکر سنائی تو میرے والدین کے بشروں پر بشاشست کھیل گئی ----- بھلا اب احسان کیسے پڑھے گا ؟ چوتھی جماعت کی کتابیں کہاں سے آئیں گی ؟ کیا کیا جائے ؟ مجبوری ہے تم دیکھ رہی ہو کہ اب مزدوری بھی کئی کئی دن میں نصیب ہوتی ہے ، والد نے مایوسانہ لہجے میں جواب دیا - اول تو مفلس پہلے ہی گھر کا تمام سامان کھا چکی تھی رہے سہے چند تانبے کے برتن تھے جنہیں میری والدہ اکھٹا کرکے لائیں اور والد کے سامنے دہلی پر ڈھیر لگا دیا پھر بڑے جی دار اور روشن لہجے میں بولیں - آخر کو یہ برتن کس کام آئیں گے ؟ ہم تو مٹی کے برتنوں میں بھی پکا کھا سکتے ہیں مگر احسان کو یہ عمر کہاں نصیب ہوگی -" [1]

---

[1] جہان دانش ، " احسان دانش " ص 71

والدین کی مفلسی نے مزید تعلیم حاصل کرنے نہ دی - انہوں نے قاضی محمد زکی صاحب کی صحبت سے فیض اٹھایا - قاضی صاحب عربی ، فارسی ، ہندی زبان میں اعلی صلاحیت رکھتے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ بلند درجہ شاعر اور مصور بھی تھے - ان اوصاف نے احسان پر بھی اپنے اثرات مرتب کئے - انہوں نے اپنے گھریلو حالات کے باوجود اپنے ان اساتذہ کی صحبت سے فیض حاصل کیا اور خوش خطی میں بچپن ہی میں نام کمایا - بچپن میں ہی انہیں موسیقی کی بھی شدھ بدھ / حاصل ہوگئی تھی -

گویا بچپن میں مفلسی نے مزید تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہ دیا - لیکن قدرت نے انہیں ایک عظیم انسان بنانے کا فیصلہ کرلیا تھا اسی لئے اس تنگدستی میں بھی فطرت اپنے اظہار کے لئے انہیں مواقع فراہم کرتی رہی اور اسی عہد میں ان کی خداداد صلاحیتوں میں نکھار پیدا ہوا - جب تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوا تو انہوں نے عملی زندگی میں قدم رکھا - ملازمتوں کی تلاش میں سرگرداں رہے - اپنی فطرت کی بے چینی اور درویشی کے سبب ایک جگہ ٹک کر کام نہ کیا بلکہ جہاں سکون ملا وہیں چل دئیے - اور ایسی ایسی کٹھن راہوں پر چلے اور ایسے دشوار راستوں سے گذرے جن سے گذرنے کا تصور ہی عام آدمی کو پریشان کرنے کے لئے کافی ہے -

زندگی کے سفر میں جسم و جان کے تعلق کو قائم رکھنے کے لئے احسان جن جن منزلوں سے گذرے ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کام کی عظمت سے

آگاہ تھے اور آگے بڑھنے کی لگن میں انہوں نے طرح طرح کے کام کئے ۔ عملی زندگی میں قدم رکھنے سے پہلے ہی وہ باغبانی اور رنگ سازی کے ہنر سیکھ چکے تھے ۔ گویا قدرت انہیں زندگی کی جفاکشی کے لئے بچپن ہی سے تیار کر رہی تھی ۔

عملی زندگی میں قدم رکھا تو اِنک مین بنے ، مہاجن کی نوکری ، بیوپاری کی ملازمت ، مزدوری ، منافع خوروں کی ملازمت ، چپراسی ، چوکیداری سراجی کا کام ، نامہ نویسی ، کتب فروشی ، رنگ سازی ، استادی ، یونیورسٹی اور شاہی قلعہ کی تعمیر و مرمت میں مزدوری ، بکڈپو کی ملازمت ، گویا ہر وہ کام کیا جوان کی طبیعت کے موافق نہ تھا اور محنت طلب بھی ایسا جس کے لئے تندرستی اور صحت کی ضرورت ہوتی ہے ۔ لیکن معاشی حالات ایسے تھے کہ جاروب کشی تک کا ارادہ بھی کیا ۔ لیکن ان کی علم دوستی اور لکھنے پڑھنے کی محبت میں کوئی فرق نہ آیا ۔ زندگی کی چکی پیستے پیستے بھی وہ لائبریری جاتے اور کتب سے استفادہ کرتے ۔ مشاعروں میں شرکت کرتے ۔ اور اپنی فہم و فراست اور علم کی بدولت ہر جگہ عزت پاتے ۔ ان کی زندگی پر نظر ڈالیں تو یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ خدا نے انہیں جوہر نایاب پیدا کیا تھا اور کندن بنانے کے لئے حالات کی بھٹی میں ڈال دیا جس میں تپ کر وہ کندن بن گئے ۔

بدترین مالی حالات میں بھی خود دار اتنے رہے کہ اگر کوئی بات طبیعت کے خلاف معلوم ہوتی تو خدا کے بھروسے اور اپنی ہمت کے برتے پہ

اس ملازمت کو چھوڑ دیتے - انہوں نے جو کام بھی کیا اس میں دیانتداری کو قائم رکھا لیکن اگر انہیں یہ احساس ہو جاتا کہ انہیں ان کی محنت سے کم معاوضہ مل رہا ہے تو پہلی فرصت میں اس نوکری کو خیر باد کہہ دیتے - کاندھلہ میں نہر کی کھدائی میں مزدوروں کے ساتھ مل کر مزدوری کی لیکن ٹھیکیداروں کی بد اخلاقی سے طبیعت اچاٹ ہوگئی اور ان کے ذہن میں اس گردش دوراں کو دیکھ کر بہت سے سوالات نے جنم لینا شروع کردیا - وہ " جہان دانش " میں ایک جگہ لکھتے ہیں -

" شروع شروع میں جب میں مجبور ہو کر والد صاحب کے ساتھ مزدوری پر جانے لگا تو سارا دن مٹی اور ریت ڈھونے سے میرا بدن چور چور ہو جاتا جیسے جسم کے ہر جوڑ کی درمیانی چکنا ہٹ خشک ہوگئی ہو ، لیکن مجبوری کا کیا علاج ----- ان دنوں اکثر مجھے یہ خیال آتا کہ کیا ساری دنیا اس معاشرے کی چکی میں پس رہی ہے اور پستی رہے گی ؟ کیا غریب لوگ ہمیشہ سے اسی طرح اپنے گرم خون کی حدت سے معدہ کے لئے ایندھن مہیا کرتے رہتے ہیں اور کرتے رہیں گے ؟ کیا ہم یہی کھیکتو میں اٹھانے آتے ہیں ؟ کیا ناداروں کے شباب اور جسم کی قوتیں اسی طرح کم کرایہ پر چلتی اور ختم ہوتی رہیں گی -؟ " ؎ۂ

ۂ احسان دانش ، " جہان دانش " ص 89 تا 90

احسان محنت سے جی نہ چراتے تھے اولاد اور بیوی سے بے حد محبت کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ ان کو حلال لقمہ کھلائیں۔ انہوں نے یونیورسٹی میں مزدوری کی اور گورکھا قسم کا رہٹ بھی چلایا۔ گورنر ہاوس میں نائب باغبان کی حیثیت سے کام کیا لیکن یہاں کا ماحول انہیں کچوکے لگاتا وہ یہاں سے بھی دلبرداشتہ ہوگئے۔ اس ماحول میں رہتے ہوئے وہ سوچتے کہ دنیا میں روپے کی تقسیم اس قدر غیر منصفانہ کیوں ہے۔ لکھتے ہیں۔

"دل نے فیصلہ کیا کہ اس محدود فضا میں ہر چیز محدود ہے۔ باہر کی کھلی فضا میں ممکن ہے کوئی روشنی نظر آئے یا کوئی رہنما نصیب ہوجائے۔ یہ خیال دماغ میں اس ہنگامے کے ساتھ آیا کہ مجھے وہاں سانس لینا دوبھر ہوگیا اور اسی وقت استعفیٰ دے کر باہر نکل آیا۔" [1]

یوں احسان دانش کی شاعرانہ طبیعت کی بیقراری نے ان کے لئے نئی راہیں کھول دیں گو گورنر ہاوس کی ملازمت کے دوران میں فطرت کی رنگینی نے ان پر نئے جہان وا کئے تھے لیکن معاشرہ کا طبقاتی فرق ان کے ذہن میں سوال اٹھاتا تھا اور پھر انہوں نے اس جگہ کو خیرباد کہہ دیا اور ان کی بے چین روح کو بشیر ہندی کے ایماء پر گیلانی بک ڈپو میں بیس روپے ماہوار کی ملازمت

---

[1] احسان دانش، "جہان دانش" ص 362

میں قدرے قرار میسر آیا علم سے اس محبت کے سبب وہ اپنی غربت و افلاس کے باوجود اپنا علم سے واسطہ تعلق نبھائے رہے اور پھر انارکلی میں اپنا " مکتبہ دانش " بنانے میں کامیاب ہوگئے - جہاں پر علم کے طالب اپنی پیاس بجھانے آتے رہے -

شاعری کی خداداد صلاحیت کو قاضی محمد ذکی کی صحبت میں نکھار ملا - اس سلسلے میں غزالہ کوثر لکھتی ہیں -

" احسان صاحب ابھی نظم کے محاسن و عیوب سے بخوبی واقف نہ تھے لیکن احساس میں نزاکت اور دل و دماغ میں غور و فکر کرنے کا شعور بیدار ہورہا تھا جس کے تحت شاعری کے جذبے نے یہاں تک زور پکڑا کہ جو دیوان بھی سامنے آجاتا اس کے ردیف و قافیہ لے کر غزلیں کہنا شروع کردیتے پھر موازنہ میں اچھے برے کا فیصلہ دینے لگے - اس طرح آپ کے لئے شاعری کرنا آسان ہوگیا -" [1]

احسان دانش نے جس عہد میں جنم لیا وہ حالی ، شبلی اور آزاد کی وفات کا زمانہ تھا - حالی ، شبلی ، آزاد نے شاعری میں انقلابی تبدیلیاں کیں - گل و بلبل کے قصوں کو چھوڑ کر شاعری میں نئے مضامین برتے اور اس کے دامن کو وسعت عطا کی - گو اس تبدیلی کے پیچھے مقصدیت کا پہلو کارفرما تھا - لیکن

[1] غزالہ کوثر ، مقالہ ایم - اے احسان دانش کی نثر نگاری ، مخزونہ پنجاب یونیورسٹی ، 1979ء ص 7

اس کے باوجود اس عہد میں ہی شاعری نے اپنا روائتی چولا بدلا اور جدید شاعری کی بنیاد پڑی ۔ احسان دانش نے بچپن ہی سے شعر کہنے شروع کردئیے تھے ۔ اور جب انہوں نے ہوش سنبھالا اسی زمانے میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا ۔ گو احسان دانش اس تحریک میں باقاعدہ شامل نہیں تھے لیکن اس کے افکار سے کسی حد تک متاثر ضرور تھے ۔ ان کے شعور میں حالی ، شبلی اور آزاد کی آوازیں بازگشت کرتی تھیں لیکن شعوری طور پر وہ اقبال اور جوش کے عہد کے شاعر تھے ۔ ان کے حالات بہت کٹھن تھے افلاس و غربت کے ساتھ ساتھ انہوں نے زندگی کی ایسی تلخ حقیقتوں کو دیکھا تھا جن میں اس عہد کا ہر عام فرد پس رہا تھا ۔ انہوں نے عزت سے روزی کمانے کے لئے کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلایا بلکہ زمانے کی چکی میں پس کر خود اپنے لئے رزق کمایا لیکن اپنی طبیعت کی آزادی کا سودا نہ کیا ۔

ان کی زندگی کے یہ تجربات ، احساسات اور نقوش ان کی شاعری میں بھی اپنی جھلک دکھانے لگے ، چونکہ ایک شاعر کا تخیل اورادراک ایک عام آدمی سے مختلف ہوتا ہے اگرچہ عام آدمی بھی انہی مشکلات سے گذرتا ہے لیکن شاعر چونکہ زمانے کا حساس فرد ہوتا ہے اس لئے وہ اپنے ان تجربات کو اپنی شاعری میں سمودیتا ہے ۔ اور اپنے تجربات کو شعری لباس پہنا کر ان کی تجسیم کرسکنے پر پوری طرح قادر ہوتا ہے ۔

اختر علی لکھتے ہیں ۔

" احسان دانش کی زبان اور دل میں مطابقت ہے اور یہی مطابقت شعر میں بھی بدرجہ اتم کارفرما ہے ان کی شاعری اخلاقی درس ، ملت نوازی ، انسان دوستی اور اخلاص کا ایک اعلیٰ نمونہ فراہم کرتی ہے ۔ انفرادی طور پر اخلاص کا دائرہ عمل بھی ان کے یہاں بڑی وسعت کا حامل ہے اور اخلاص کی یہی وسعت احسان دانش کی عظمت کا ایک پہلو بھی ہے ۔ احسان دانش کے شعر ان کی روح کی گہرائیوں سے بے اختیار نکلتے ہیں اور شعری فضا میں جذب ہوجاتے ہیں ان کی شاعری میں متنوع مضامین باندھے گئے ہیں ۔ زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس پر انہوں نے طبع آزمائی نہ کی ہو ۔ زندگی کے چھوٹے چھوٹے اور معمولی پہلوؤں کو بھی انہوں نے اپنے شعری تجربہ کی بدولت شعر کا ذوق رکھنے والے لوگوں کی توجہ کا مرکز بنادیا ۔ "[1]

احسان دانش کے اندر پوشیدہ صلاحیتیں موجود تھیں وہ اپنی ان صلاحیتوں کو بروئے کار لائے ۔ ان کی شاعری کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ زندگی کی تلخ کامیوں سے گھبراتے نہیں ہیں ان کی شاعری بھی زندگی کی ناامیدیوں سے گھبرا کر

---

[1] اختر علی ، " احسان دانش کی شاعری پر ایک نظر " ماہنامہ ۔ قومی زبان کراچی مئی 1982ء ، جلد 52 ۔ شمارہ 5 ۔ انجمن ترقی اردو پاکستان ص 7 ۔ 6

بھاگنے کا درس نہیں دیتی - ان کے کلام میں زندگی کی رمق موجود ہے - وہ انسان کو انسان کے درجے پر فائز دیکھنے کے خواہاں نظر آتے ہیں -
اختر علی لکھتے ہیں -

" احسان دانش سادہ دل ، سادہ منش ، سادہ مزاج اور سادہ طبیعت ہونے کے ساتھ ساتھ کائنات کے عالمگیر جذبہ راستی و سچائی سے مالا مال بھی ہیں - راستی و سچائی ایک ایسی قوت ہے جسے کوئی باطل قوت زیر نہیں کر سکتی - آزاد شاعری نے بھی احسان دانش کے زمانہ میں جنم لیا - جس کے علمبردار ن - م - راشد ، میرا جی ، تصدق حسین خالد تھے - انہوں نے اس میدان میں ہیئت کے نئے نئے تجربات کئے مگر احسان دانش ان نئے نئے تجربوں کو اپنانے کے قائل نہیں اور نہ ہی آزاد شاعری کو کوئی خاص اہمیت دیتے ---- ان کے یہاں نئی نئی ترکیبوں اور نادر تشبیہات نے جنم لیا - ترنم و نغمگی بھی ان کے شعری ورثہ کی ایک اہم جزو ہے وہ ایک زبان دان ، ماہر لسانیات ، اور فن شعری کی روح سے اپنائیت اور آشنائی رکھتے تھے ---- انہوں نے اکثر اشعار کو بحر ہزج ، بحر رمل ، اور بحر رجز کا شعری لہجہ عطا کرکے

نو نم و نغمگی کی فضا قائم کی -" سہ[1]

سہ موت کے پردے سے کم ہوتی نہیں تا بندگی
اس طرف بھی زندگی ہے اس طرف بھی زندگی

احسان دانش کی تصانیف

شعری مجموعے "

1 -	حدیث ادب	غزلیں	صفحات 160
2 -	درد زندگی	نظمیں اور غزلیں	ص 348
3 -	نفیر فطرت	کتاب اول دوم میں جملہ کلام کا اضافہ	ص 320
4 -	نوائے کارگر	نظمیں اور غزلیں	ص 352
5 -	چراغاں	نظمیں اور غزلیں	ص 240
6 -	آتش خاموش	" "	ص 208
7 -	مقامات	" "	ص 224
8 -	شیرازہ	" "	ص 224
9 -	جادہ نو	قطعات	ص 94
10	زخم و مرہم	"	ص 94

سہ[1] اختر علی ، " احسان دانش کی شاعری پر ایک نظر " ماہنامہ قومی زبان کراچی انجمن ترقی اردو - مئی 1982ء جلد 52 - شمارہ 5 ص 8

11 -	گورستان	والدہ کا مرثیہ	ص 112
12 -	میراث مومن	جنگی نظمیں	ص 144

غیر مطبوعہ کلام کے مجموعے

13 -	فصل سلاسل	نظمیں اور غزلیں	ص 150
14 -	قفس رنگ	" "	ص 150
15 -	قصر نگاراں	" "	ص 250
16 -	زنجیر بہاراں	" "	ص 300
17 -	سازشیں	" "	ص 300
18 -	بام و برزن	" "	ص 300
19 -	عکس و آئینہ	مشاہدات	ص 112
20	غبار کارواں	قطعات	ص 112

مطبوعہ نثری ادب

21 -	روشنیاں	اقوال	ص 112
22 -	طبقات	یاد داشتیں	ص 240
23 -	خضر عروض	علم عروض	ص 64
24 -	دستور اردو	علم زبان	ص 140
25 -	لغات الاصلاح	اصلاح زبان	ص 352

26۔	اردو مترادفات	جدید لغت		ص 267
27۔	اردو تذکیر و تانیث	اصول زبان		ص 370
28۔	رموز غالب	شرح غالب		ص 450
29۔	جہان دانش	خود نوشت جلد اول		ص 650

غیر مطبوعہ نثری ادب

30۔	فرہنگ دانش	لغت	3 جلدیں	ص 300
31۔	فرہنگ قدیم	"	1 "	ص 400
32۔	دانش ابلاغ	علم معانی و بیان		ص 700
33۔	علم الامثال	ضرب الامثال پر کتاب		ص 700
34۔	قاموس المحاورات	اردو محاورات		ص 800

ان کے علاوہ ریاضی کی دس کتب پانچویں جماعت تک کے لئے ص 650

" الحساب " کے نام سے لکھیں۔

اب ہم احسان دانش کی چند اہم مطبوعہ نثری تصنیفات کا مختصر تعارف پیش کریں گے۔

*****

طبقات = [1]

یہ مختصر انشائیوں پر مشتمل نثر پارہ ہے جس میں انہوں نے اپنی یاد داشتیں قلمبند کی ہیں - یہ تحریریں ان کے گہرے مطالعے، مشاہدے اور تجربات پر مشتمل ہیں -

روشنیاں = [2]

ان کے اقوال زریں پر مشتمل ایک خوبصورت کاوش ہے - جس میں جگہ جگہ ان کے مطالعے مشاہدے اور تجربے کی ہمہ گیریت کا احساس ہوتا ہے -

رموز غالب =

بنیادی طور پر کلام غالب کی شرح ہے لیکن اس کے آغاز میں ہمیں غالب کے حالات زندگی ، عادات و خصائل ، کلام کی نمایاں خصوصیات سے بحث ملتی ہے -

علمی تصانیف =

احسان دانش کی علمی تصانیف تمام تر لسانیات کے موضوع سے متعلق ہیں - اس ایک ہی مسئلے کو انہوں نے کئی رنگ سے واضح کیا ہے -

---

[1] احسان دانش ، " طبقات " لاہور - مکتبہ دانش ، 1952ء

[2] احسان دانش ، روشنیاں ، مقالات - لاہور مکتبہ دانش ، 1942ء

تذکیر و تانیث - [1]

اردو چونکہ لشکری زبان ہے اس میں دوسری بہت سی زبانوں کو جذب کرنے کی صلاحیت ہے - لہذا انہوں نے اس کتاب میں اردو تذکیر و تانیث کے مسئلے کو دوسری زبانوں کی تذکیر و تانیث کے حوالے سے واضح کرنے کی کوشش کی ہے - اس کے کل صفحات 370 ہیں -

خضر عروض"

علم عروض کے بارے میں خضر عروض ایک رسالہ ہے جس میں مصنف نے اس مسئلے کو اٹھایا ہے کہ اردو زبان کے لئے عربی عروض اس کے ڈھانچے اور نوعیت کے اعتبار سے موزوں نہیں - گویا انہوں نے بدلتے ہوئے ادبی ماحول کے تقاضے کو سمجھنے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے -

اردو مترادفات - [2]

اس لغت میں انہوں نے اردو مترادفات کی ایک طویل فہرست دے کر ادیبوں ، شاعروں ، صحافیوں اور طلبا کی دیرینہ خواہش کی تکمیل کی ہے - یہ کتاب 262 صفحات پر مشتمل ہے -

---

[1] احسان دانش ، تذکیر و تانیث " لاہور - مرکزی بورڈ ، 1970ء

[2] احسان دانش ، اردو مترادفات - لاہور - مرکزی اردو بورڈ - 1970ء

دستور اردو - [1]

اس کتاب کا تعارف کراتے ہوئے وہ کہتے ہیں (اس کتاب کا مقصد) اردو نثر کی تصنیفی و تالیفی کارناموں اور روزمرہ کے ان اغلاط کی اصلاح و تحقیق ہے جو تقریر و تحریر کے طول وعروض پر حاوی ہیں اور زبان و قلم کی ہر سعی کو معیار فصاحت سے گرا دیتے ہیں - گویا دستور اردو الفاظ کے فصیح اور غیر فصیح ہونے پر حکم لگاتی ہے -

لغات الاصلاح -

یہ لغت بھی تلفظ کی ادائیگی اور اصلاح کے لئے رہنما کی حیثیت رکھتی ہے - اس میں حروف تہجی کے لحاظ سے ا سے ی تک الفاظ کی فرہنگ ملتی ہے اور روزمرہ محاورہ کی فہرست بھی موجود ہے جس سے قاری سہولت سے جان لیتا ہے کہ جو لفظ وہ استعمال کر رہا ہے وہ اردو کا ہے یا نہیں -

نظریہ پاکستان -

خالص سیاسی موضوع ہے جس میں اورنگ زیب عالمگیر کی " فتاوی عالمگیری " کے تاریخی حوالوں سے پاکستانیوں کی آنکھیں کھولنے کی کوشش کی ہے - انہوں نے نظریہ پاکستان کی وضاحت ، رہنماؤں ، شعراء

---

[1] احسان دانش ، " دستور اردو - اصول فصاحت -
لاہور مکتبہ دانش - 1951 ء

اور ادباء اور عوام کے نقطہ نظر سے کی ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ اب ہمارے فرائض کیا ہیں ۔

جدید شاعری *

یہ کتاب انہوں نے تذکرے کے انداز میں لکھی ہے ۔ اسے جدید شاعری کی مختصر تاریخ بھی کہا جا سکتا ہے ۔ اس میں وہ جدید شاعری کی تکنیکی تبدیلی یعنی آزاد نظم کو شاعری نہیں سمجھتے لیکن جدید شاعری کے متنوع موضوعات کو درست تسلیم کرنے کو تیار ہیں ۔

****

دیباچے *

احسان دانش کا اپنا قول ہے کہ

" کتاب پر مقدمہ ادبی رشوت سے کم نہیں "

لیکن انہوں نے بھی بہت سی کتابوں کے دیباچے لکھے ۔ انہوں نے اقبال عظیم کے نعتیہ مجموعہ کلام ، قاب قوسین ، خود اپنے مجموعہ کلام نوائے کارگر ، مظفر علی ظفر ، ظفر موج کے علاوہ سرفراز قریشی ، ڈاکٹر صابر آفاقی ، اور رابعہ نہاں کے مجموعوں پر دیباچے لکھے ۔ ان دیباچوں میں انہوں نے ایک بات کو مقدم رکھا ہے کہ آیا شاعروں نے اپنی شاعری کے ذریعے اخلاقی پیغام دیا ہے یا نہیں ؟

احسان دانش کی تخلیقی کاوشوں نظم و نثر کے اس مختصر سے جائیزہ سے ایک بات واضح طور پر سمجھ آتی ہے کہ احسان دانش نے محنت اور بھرپور لگن سے اپنے تجربات اور مشاہدات کو قاری کے سامنے رکھا ہے - انہوں نے جس عسرت میں زندگی کے اکثر دن گذارے اس نے انہیں ادبی مال و دولت سے مالا مال کردیا اور وہ کسی خاص ادبی پس منظر نہ رکھنے والے خاندان کے چشم و چراغ ہونے کے باوجود ایک زمانے کو ایک خاص ادبی پیش منظر دینے میں غیر متنازعہ طور پر کامیاب ہوئے -

احسان دانش پیدا ہوئے تو حالی ، شبلی اور آزاد اس جہان فانی سے رخصت ہورہے تھے ، جوان ہوئے تو ترقی پسند تحریک اور علامہ اقبال کا لب و لہجہ زبان زد عام تھا - اس کے باوجود احسان دانش اس عہد میں اپنا ادبی مقام بنانے میں کامیاب رہے - ان کا اسلوب اپنا ہے جو سب میں جدا الگ شناخت رکھتا ہے - ان کی نظم و نثر میں زندگی جھانکتی ہے - جو ان کی واردات کو کھرے پن اور سچے تاثر سے بھرا بھرا رکھتی ہے -

*****

باب چہارم

"جہان دانش" کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ

باب چہارم

" جہان دانش کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ "

آپ بیتی کی اہمیت ہماری زندگی میں مُسلّم ہے - انسان اپنی زندگی کے واقعات دہراتا رہتا ہے کبھی دوسروں کو نصیحت کرنے کے لئے اور کبھی خود راستہ تلاش کرنے کے لئے ماضی کی طرف پلٹ کر دیکھتا ہے۔ اور یوں ان غلطیوں کو دہرانے سے گریز کرتا ہے جن کا خمیازہ وہ ایک مرتبہ پہلے بھگت چکا ہوتا ہے -

جہاں " آپ بیتی " اپنی ذات کے اظہار کا نام ہے وہاں یہ اخفا کا نام بھی ہے - زندگی کے کچھ واقعات ایسے ہوتے ہیں جن کا گواہ صرف خدا ہوتا ہے - اور انسان ان واقعات کو کسی مصلحت کے تحت مخفی رکھتا ہے - یوں جب کوئی شخصیت اپنی آپ بیتی لکھتی ہے تو ایسے بہت سے واقعات کو پردۂ اخفا کے سپرد کردیتی ہے - فرائڈ کے نزدیک انسانی شخصیت اور ذہن سمندر میں تیرنے والے ایک تودے کی مانند ہے جس کا ایک بیشتر حصہ پانی کی تہہ میں مخفی ہوتا ہے اور باقی حصہ پانی کی سطح کے اوپر نظر آتا ہے -

انسان کی شخصیت مختلف حالات و واقعات سے اثر قبول کرتی ہے - اس کی شخصیت کی تعمیر و ترکیب میں ماحول اور ورثہ دونوں اثر انداز ہوتے ہیں - بعض اوقات معمولی لغزش اسے پستیوں میں جا دھکیلتی ہے اور بعض اوقات ایک اہم فیصلہ اسے بلندی و رفعت سے ہمکنار کرتا ہے - لاشعور اور شعور انسان کو عمل کی طرف راغب کرتے ہیں اور اس کے نظریات و افکار میں تبدیلی کا سامان پیدا کرتے ہیں - خود شناسی کا عمل تب تک مکمل نہیں ہوتا جب تک انسان اپنی ذات کے اندر سفر نہ کرے - وہ دیکھتا اور سوچتا ہے کہ وہ کونسے افعال و خصائص تھے جن کی بدولت اس کی ذات دوسروں سے مختلف ہوگئی اور وہ عام سطح سے بلند ہوگیا ؟ کیا اس کے والدین ، بہن بھائی - عزیز واقارب ، گھر کی تربیت ، ماحول ، بچپن ، جوانی ، بڑھاپا ، تعلیم ، وغیرہ ان سب کے نقوش اس قدر گہرے تھے کہ ان کے منطقی نتیجے کے طور پر وہ ایک منفرد اور ممتاز شخصیت بن گیا -؟

مشرق اور مغرب میں فرق صرف قطبین کے بُعد کا نہیں بلکہ یہ تفاوت ہمیں مشرق و مغرب کے طرز احساس اور طرز زیست دونوں میں نظر آتا ہے - مغرب میں لکھی گئی آپ بیتیوں کے معیارات مشرق سے مختلف ہیں - مشرق کا رکھ رکھاو اور مشرقی اقدار حد ادب کی پاسداری کو ملحوظ رکھتی ہیں - انسان گوشت پوست سے تخلیق کیا گیا - اور اس میں بہت سی بشری کمزوریاں موجود ہیں - کسی انسان کی تحریر کو اس نظریے سے پڑھنا کہ اس

میں ہمیں فرشتوں کی سی پاکیزگی اور معصومیت ملے گی، کسی طرح سے بھی درست نہیں - ہم سوائے آسمانی کتب اور صحائف کے اس بات کا تقاضا کسی انسان سے نہیں کر سکتے -

آپ بیتی نگار کا نقطہ نگاہ بیک وقت معروضی اور داخلی ہوتا ہے - اور یہ فطرت انسانی ہے کہ ہر شخص میں خود نمائی کا جذبہ موجود ہوتا ہے وہ اپنا ذکر چاہتا ہے اور اپنی ذات کے اظہار کے لئے ساری زندگی کوشش کرتا ہے - " آپ بیتی " جیسی اصناف اور دنیا کے بیشتر فنون لطیفہ اپنی ذات کے اظہار کی صورت ہیں - آپ بیتی اپنی ذات و صفات خیالات و اطوار کے اظہار کی ایک اعلانیہ صورت ہے ، اس میں اگر دروغ گوئی سے کام لے تو اس کا اظہار بھی ہو جاتا ہے اور سچ تو خود ہی اپنے سچ ہونے کا اعتراف کروا لیتا ہے -

" جہان دانش " اسمی با مسمیٰ آپ بیتی ہے - اس خود نوشت سوانح عمری میں دانش کے وہ موتی بکھرے ہوئے ہیں جو اپنے بیش قیمت ہونے کا اعلان کرتے ہیں - آپ بیتی لکھنا کچھ ایسا نا ممکن تو نہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ بہت نازک اور دشوار کام ہے - روسو نے بھی " اعترافات " میں لکھا ہے کہ میں نے اپنا کوئی جرم نہیں چھپایا لیکن ساتھ ساتھ یہ اعتراف بھی کیا ہے کہ میں نے مجبوراً زیب داستان کے لئے کچھ خلا پر کئے ہیں - " آپ بیتی " تحریر کرتے وقت اسے لکھنے والے پر بہت

سی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں - اور کچھ فن کے تقاضے بھی ایسے ہوتے ہیں جن سے مفر ممکن نہیں - آپ بیتی لکھنے والا اپنے عیب و ہنر کی تصویرکشی کے ساتھ ساتھ معاشرے کے لئے کچھ مفید اور سبق آموز واقعات کو بھی ترتیب دیتا ہے - وہ اپنی جد و جہد کو بیان کرکے اپنی آپ بیتی کو معنی پہناتا ہے تا کہ اس کی کاوش کم از کم واقعات اور روداد کا سچا پس اجاگر کرنے میں نہ چوکے -

" جہان دانش " کا شمار ان آپ بیتیوں میں ہوتا ہے جو با مقصد اور بامعنی ہیں ، احسان دانش کی یہ آپ بیتی ہمیں بتاتی ہے کہ زندگی کے دھارے کس کس موڑ پر کون کونسی چٹانوں سے ٹکراتے ہیں - یہ ایک ایسے شخص کی داستان حیات ہے جس نے اپنی زندگی کی سختیوں ، آزمائشوں اور امتحانوں سے ہار نہیں مانی بلکہ زندگی کو ایسے گذارا ہے کہ ان کا مقام و مرتبہ بلند سے بلند تر ہوتا گیا -

جمیل احمد عدیل لکھتے ہیں -

" احسان دانش نے زندگی جبر مسلسل کی طرح کاٹی ہے لیکن اپنی خود نوشت سوانح عمری " جہان دانش " کے صفحات میں کسی ایک جگہ بھی انہوں نے خود فریبی پر مشتمل ابہام سے خود کو پوتر اور مقدس ثابت کرنے کی جلی یا خفی سعی نہیں کی - انہیں سب یاد ہے کہ انہوں نے کس جرم کی کیا

سزا پائی ؟ مگر ان کے ہاں نہ تو جرم کا واضح تصور ہے نہ سزا
کا روایتی مفہوم ہے کہ وہ قدر اور قیمت کی اصل فلسفیانہ اور
عارفانہ تہہ تک برسوں کی ریاضت کے بعد پہنچ چکے تھے ۔ انہوں
نے ہر تکلیف و رنج کے لمحے اور عسرت و مفلسی کی زیست
میں اس خیال سے خود کو مطمئن کرلیا کہ اگر کچھ سہولتیں میسر
نہیں تو وہ قیمت سے خریدی جاسکتی ہیں ۔ مگر ان کے اندر ایک
ایسا جوہر موجود ہے جس کی کوئی قیمت نہیں کہ قدر والی اشیا
کی قیمت ہوا ہی نہیں کرتی وہ انمول گوہر تھا تخلیقی جوہر ۔۔۔
اسی لئے روزگار کی چکی کی مشقت عمر بھر برداشت کرنے کے
باوجود آپ نے مشق سخن جاری رکھی ۔" [1]

احسان دانش نے زندگی کی اس رزم گاہ میں اپنی علمی ، ذہنی ، روحانی ، رومانی ، جد و جہد کا ذکر کیا ہے اور اپنی ذات کو تمام بحرانوں میں سمیٹے رکھا اور یہ تمام آلام و آفات ان کو پسپا کرنے میں ناکام رہے اور انہوں نے اپنی محنت ارادے مشقت اور عالی حوصلے سے اس رزم گاہ حیات کو فتح کرلیا ۔ احسان دانش اپنی زندگی میں جس قدر مستعد فعال اور سرگرم رہے اسی طرح سے" جہان دانش " کا قاری بھی اس کو یہ تمام

---

[1] جمیل احمد عدیل ، " سیاق و سباق " بار اول 1995ء
لاہور عمیر پبلشرز اردو بازار ۔ ص 56

ہوش و حواس پڑھتا ہے - وہ جیسے جیسے آگے بڑھتا ہے اس کے اندر کی دنیا بیدار ہوتی جاتی ہے - وہ احسان دانش کی زندگی کے ساتھ ساتھ حیات سے بھی آگاہ ہونے لگتا ہے -

ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں -

" یہ احسان دانش کی کہانی ہے - مگر یہ وہ کہانی نہیں جسے افسانہ سمجھ کر کوئی اونگھنے لگے - یہ تو وہ کہانی ہے جسے سن کر سوئے ہوئے بھی جاگ اٹھیں گے - میری جگہ کوئی اور ہوتا تو جہان دانش میں غزالوں کے خرام اور قمریوں کی گلوکاری کے قصے تلاش کرتا ــــ اور یہ ڈھونڈھتا کہ احسان نے اپنے گناہوں اور جرموں کی جزئیات و تفصیلات کو رنگین الفاظ کے گلدستوں میں کس حد تک سجایا ہے - اس نے شرافت کے مسلمات کا اپنے عمل سے کس طرح مذاق اڑایا ہے اور انسان کو شر محض ثابت کرنے کیلئے ، ضبط نفس اور متانت کی دھجیاں کس طرح بکھیری ہیں ــــ مگر میں یہ دیکھوں گا کہ بشریت کے پیچ در پیچ عنکبوتی جالوں کی گرفت کے باوجود (کہ افتاد ودائی کے مصداق ، بنی آدم کا مقدر ہے) احسان نے رفعت کی جد و جہد میں بشریت کی قربانی دے کر انسانیت کے جزیرے میں کہاں قدم رکھا -" ـــہ[1]

ـــہ[1] ڈاکٹر سید عبداللہ ، " وجہی سے عبدالحق تک "
لاہور مکتبہ خیابان ادب طبع دوم ، 1977 ، ص 330

احسان دانش کی ذات میں غم اور مصائب کے سناٹے گونجتے رہے لیکن اس کے باوجود ان کے تخلیقی جوہر نے اس سناٹے کو موت کا پیش خیمہ نہ بننے دیا بلکہ اس سناٹے نے ان کی روح کو بالیدگی عطا کی اور ایک ایسے سکون سے ہمکنار کیا جس میں ان کے تخلیقی جوہر میں روئیدگی اور نکھار پیدا ہوا - وہ زندگی کرنے کا سلیقہ رکھتے تھے وہ معاشرے میں اپنا مقام بنانا چاہتے تھے اور اس میں کامیاب بھی ہوئے - انہوں نے زندگی کے تمام آلام و مصائب کا مسکرا کر سامنا کیا - ان غموں نے ان کی روح کو بوسیدہ اور ان کے جذبات کو پتھر نہیں بنایا بلکہ انہیں ایک با مقصد زندگی گذارنے پہ آمادہ کیا -

احسان دانش نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ افلاس اور تنگدستی سے عبارت تھا - انہوں نے اس افلاس اور تنگدستی سے منہ پھیرنے کی بجائے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مقابلہ کیا - یہی وجہ ہے کہ " جہان دانش " کے الفاظ محض ایک ادیب کے الفاظ معلوم نہیں ہوتے بلکہ ایک ایسے مزدور کے الفاظ محسوس ہوتے ہیں جس نے انگلیوں کی تھکن کو لفظوں کے قالب میں ڈھالا ہو - احسان دانش نے جس معاشرتی ناہمواری کو دیکھا اس کی بھٹی میں تپنے کے بعد اس کرب کے خلاف آواز بلند کی - ان کی تحریروں میں ہمیں کسانوں ، مزدوروں کی تلخ زندگی کی حقیقی تصاویر نظر آتی ہیں - کہ اک بندہ مزدور کے اوقات کس قدر تلخ ہیں اور اس کی زندگی کن فکروں کسے

گرد گھوم گھام کو ختم ہو جاتی ہے - ان فکروں میں سب سے بڑی فکر پیٹ کی آگ ہے - یہ پیٹ کی آگ اسے کچھ اور سوچنے کے قابل نہیں چھوڑتی - وہ جب سوتا ہے تو اس کے دل میں یہ خوف ہوتا ہے کہ کل کا دن نجانے کیسا ہوگا ؟ اور جب جاگتا ہے تو پرندوں کی طرح اپنے آشیانے سے ان دیکھے رزق کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا ہے -

احسان دانش نے اس کرب کو صرف دیکھا اور سنا ہی نہیں بلکہ اپنی جان پر سہا ہے اپنی فطرت کے خلاف کام کرنے کے بعد اس جنگ میں مصروف ہو جاتے جو ان کی فطرت اور اس کام کے درمیان جاری رہتی وہ وقتی طور پر خلاف فطرت کام کر ڈالتے مگر ذرا سا سہارا ملنے پر اس جبر کو خود سے اتار پھینکتے اور خود کو ہلکا پھلکا اور مطمئن محسوس کرتے - چونکہ یہ الفاظ یہ تحریر ان کے اندر سے نکلی ہے اس لئے اس کی تاثیر قاری کو بھی متاثر کرتی ہے - اور یوں ان کی تحریر ایک کھوکھلا نعرہ بننے کی بجائے حقیقت میں داستان حیات کہلانے کی مستحق قرار پاتی ہے - ان کے لفظ زندہ ہیں - احسان دانش نے خود تخلیق کے کرب کو سہا ہے اس لئے ان کی تحریر میں ایک سچے تخلیق کار کی تڑپ محسوس ہوتی ہے -

وہ بندۂ مزدور ، کسان اور جفاکش لوگوں کا ذکر محض اپنی تحریر میں رنگ بھرنے کے لئے نہیں کرتے بلکہ وہ ان خیالات و افکار کو پرکھنے کے بعد بیان کرتے ہیں جس سے ان کی تحریر اور الفاظ کو زندگی ملتی ہے اور ان

کی تحریریں محض الفاظ کا لاشہ محسوس نہیں ہوتیں بلکہ ہم اس تحریر کو ان کی زندگی کا ثمر قرار دینے میں کسی قسم کی جھجک محسوس نہیں کرتے۔ ان کی تحریر کی سچائی ان کی بشری عظمت کو مزید مستحکم بنادیتی ہے اور ان کی تحریر محض کھوکھلا نعرہ محسوس نہیں ہوتی بلکہ مزدوروں کی زندگی کی زندہ تلخیص دکھائی دیتی ہے۔

جہان دانش 1975ء میں منظر عام پر آئی۔ احسان دانش کی یہ خود نوشت سوانح 645 صفحات پر مشتمل ہے۔ احسان دانش نے اس کا آغاز اپنے مولد " کاندھلہ " ضلع مظفر نگر یوپی سے کیا ہے اور اپنی زندگی کے واقعات " قائد ملت کی شہادت " 1948ء تک رقم کئے ہیں۔

" دیباچۂ حیات " میں لکھتے ہیں کہ انہوں نے اپنی خود نوشت سوانح لکھنے کا ارادہ کئی بار کیا لیکن یہ سوچ کر نہ لکھ پائے کہ کہیں قارئین اسے رحم کی درخواست نہ سمجھ بیٹھیں۔ احسان دانش ایک باحوصلہ اور محنت کی عظمت پر یقین رکھنے والے باہمت انسان تھے۔ وہ ایک مصیبت سے دوسری مصیبت تک کے درمیانی فاصلے کو " سکون حیات " سے تعبیر کرتے ہیں۔ انہوں نے اس سوانح عمری میں محض اپنی زندگی کے اہم واقعات کو ہی نہیں سمویا بلکہ اس میں اپنے محسنوں، دوستوں اور ساتھیوں کا شکریہ ادا کیا ہے جنہوں نے انہیں زندگی گذارنے کا سلیقہ سکھایا۔

احسان دانش ایک غریب اور محنت کش طبقہ سے نکل کر آئے تحصیل علم کی وہ آسانیاں جو انسانی شعور کو مخصوص سانچوں میں ڈھالتی ہیں انہیں میسر نہ تھیں - زندگی کے لاکھوں مسائل میں انہیں اپنا راستہ خود تلاش کرنا تھا - احسان کی زندگی اور فن کے ان حقائق کی طرف ہمیں پوری توجہ سے دیکھنا چاہیے کہ ان کی روح میں وہ کونسا کرب اور اندوہ تھا جس نے انہیں انحطاط کی طرف مائل نہ ہونے دیا -

وہ اپنی عمر کی باولی کی گہرائی سے باخبر ہونے کے ساتھ ساتھ اس بات سے بھی بخوبی آگاہ تھے کہ باولی گہری ہونے کے ساتھ ساتھ روشن ہے - کوئی عمل بھی ایسا نہیں ہوا جس سے اس کے اجالے میں کمی آئے اور وہ اپنے سیاہ گوشوں میں قارئین کو بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیں - لکھتے ہیں -

" میری عمر کی باولی گہری ضرور ہے لیکن اندھیری نہیں - جب اس میں جھانکتا ہوں تو چاروں طرف طاقوں میں چراغ جل اٹھتے ہیں اور سیڑھیاں اس قدر روشن ہو جاتی ہیں کہ درزیں تک نظر آنے لگتی ہیں - مجھے میرے ماضی نے اس قدر کھندلا ہے کہ کہیں تو پٹخنیاں کھا کھا کر میرا بدن نیلا پڑ گیا اور کہیں چوٹل جگہیں اپنی سطح سے ابھری کی ابھری رہ گئی ہیں مگر نظر میں نہ رسی آ گئی " [1]

---

[1] احسان دانش ، " جہان دانش " ص 11

جہان دانش پر لکھنے والوں میں سے اکثر نے اس اقتباس کو نقل کیا ہے جس کی وجہ ایک سچے پن کی دلکشی اور کشش ہے ۔ احسان دانش کے جملوں کی حقیقت قاری کے ذہن کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے اور وہ گرد و پیش سے بے خبر ہوکر اس " باولی " میں اترتا چلا جاتا ہے اور دیکھتا ہے کہ احسان دانش کی زندگی کی کونسی حقیقت اس روشنی کی دسترس سے باہر ہے ؟

احسان دانش نے اس داستان حیات کو لکھنے سے پہلے اپنے ماضی پر اس طرح نظر ڈالی کہ اس کے بہت سے مدفون اور زخمی لمحے بھی وقت کی دھول ہٹا کر ان سے مخاطب ہوگئے ۔ انہیں اس بات کا شعوری احساس تھا کہ

" آپ بیتی لکھنے والا انسان ناول نویس یا افسانہ نگار کی طرح ادب تخلیق نہیں کرتا بلکہ ان کے جادہ فکر سے ہٹ کر گذری ہوئی صداقتوں کو عصر حاضر کے بالا پر میں اس طرح رفو کرتا ہے کہ سیون دکھائی نہیں دیتی " [1]

وہ " آپ بیتی " کو دیگر اصناف سے اس لئے بھی الگ قرار دیتے ہیں کہ خود نوشت سوانح نگار ڈرامہ کی طرح کردار تخلیق نہیں کرتا بلکہ وہ ماضی

---

[1] احسان دانش ، " جہان دانش " ص 12

کے قافلے کے شناسا کرداروں کا رخ مرکز کی طرف موڑتا ہے وہ اپنی ذات کو بھی اس طرح سے پیش کرتا ہے کہ وہ بھی ایک کردار محسوس ہونے لگے۔ انہوں نے اپنی زندگی کے تمام واقعات کو اس " جہان دانش " میں نہیں لکھ دیا بلکہ بعض واقعات کو طوالت و ضخامت کے پیش نظر دوسرے ایڈیشن یا دوسری جلد کے لئے محفوظ رکھا ہے۔ احسان کی زندگی ہنگاموں سے بھری پڑی ہے یہ ہنگامے رزم گاہ حیات کے جیتے جاگتے مرقعے ہیں۔ احسان دانش پر ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ اس میں سنین نہیں ملتے اس کے جواب میں وہ لکھتے ہیں۔

" مجھے احساس ہے کہ میں واقعات کی ترتیب میں بھٹکا ہوں، لیکن کہاں تک نہ بھٹکتا ؟ میں نے جہاں اور جس نشیب سے سفر شروع کیا ہے وہ ایسا تھا کہ علم و ادب کے قافلے اس سے بہت آگے جا چکے تھے۔ اور وہاں یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا کہ کبھی ایسا وقت بھی آئے گا کہ مجھے اپنی آپ بیتی لکھنے کا ناگوار فرض ادا کرنا پڑے گا۔ یہی سبب ہے کہ آپ کو اس سوانح میں سنین نہیں ملیں گے۔ ویسے بھی مجھے ہندسہ، نام اور رستہ اچھی طرح یاد نہیں رہتا اور نہ کبھی یاد رکھنے کی کوشش کی ہے۔ علاوہ ازیں میری کتاب کوئی تاریخ کی کتاب نہیں یہ تو میرے غیر منظم اور مختصر واقعات کی یاد داشتیں ہیں یا یوں

کہہ لیجئیے کہ میرے دھندلے دھندلے نقوش حیات ہیں اور اس خیال سے پیش کر رہا ہوں کہ شاید یہ کسی رخ سے انسانیت کے لئیے مفید ہوں اور بس ۔ " [1]

احسان دانش نے " جہان دانش " میں سیاست اور مذہب کے رموز و غوامض سے بحث نہیں کی بلکہ وہ خود کو محض محبت کا بندہ خیال کرتے ہیں اور اسی محبت کے حوالے سے وہ دنیا کو وہ کچھ منافع سمیت لوٹانے کی کوشش کرنا چاہتے ہیں جو کچھ اس دنیا سے انہیں ملا ۔

اس رزم گاہ حیات میں مقابلہ کرنے کے لئیے ان کے پاس نہ تو کوئی لشکر تھا نہ اسلحہ نہ تلوار ان کے پاس نہ تو کوئی اہم سرکاری عہدہ تھا نہ کوئی کلیدی منصب تھا جس کے عوض انہیں کوئی سرکاری وظیفہ ، سند یا خطاب ملتا بلکہ ان کو سرخرو کرنے کے لئیے قدرت نے انہیں " قلم " عطا کیا تھا ۔ جس نے ان کے کنبے کی کفالت کی اور وہ جرات رندانہ بخشی جس نے انہیں جہان دانش قلمبند کرنے کا حوصلہ دیا وہ اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ خدا نے انہیں رزق حلال کمانے اور اولاد کو حلال لقمہ کھلانے کا موقع اور حوصلہ دیا ۔ خدا نے انہیں جو زور بازو عطا کیا تھا اس نے انہیں اس دنیا میں سربلند رکھا وہ رزق حلال کے متلاشی اور خدا کی ذات پر کامل

---

[1] احسان دانش ، " جہان دانش " ص 13

بھروسا رکھنے والے با ہمت انسان تھے ۔

" احسان اپنی موجودہ زندگی سے مطمئن نہیں تھے ۔ ان کا تیز ذہن اور ان کا جذبہ عمل کاندھلہ کی چار دیواری میں مقید نہیں رہنا چاہتا تھا ۔ ان کی اضطراری روح قفس کو توڑ کر آسمان کی پنہائیوں میں پرواز کرنا چاہتی تھی ۔ وہ زندگی اور کتابوں کے مطالعے میں ہمہ تن مصروف تھے ۔ سخت جسمانی مشقت اور معاشی زبوں حالی سے ان کے جذبہ عمل میں روز بروز توانائی اور صحت مندی پیدا ہو رہی تھی ۔ وہ بہت دنوں تک کھیتوں ،نہروں ، سڑکوں ،دفتروں کے رستے ناپتے رہے آخر کار وہ اپنے تنگ ماحول کے دائرے سے نکل کر دہلی چلے گئے جہاں ایک چھاپہ خانہ میں آٹھ روپیہ ماہوار پر سیاہی مین کی جگہ کام کرنے لگے ۔ ظاہر ہے یہ زندگی پچھلی زندگی سے بہتر نہ تھی وطن میں مصائب و مفلسی کی زندگی ضرور تھی مگر وہاں ماں باپ دوستوں کے جانے پہچانے چہرے تھے ۔ صبر و اخلاص تھا ۔۔۔ لیکن پردیس میں غربت بھی تھی اور محبت اور ہمدردی بھی مفقود تھی ۔۔۔۔ لہذا کچھ دنوں بعد وہ کاندھلہ لوٹ آئے اور اپنے وطن کے مانوس راستوں کی ایک بار پھر خاک چھاننے لگے ۔" [1]

---

[1] سجاد حارث ، " عوامی شاعر اور ان کا فن " لاہور
مقبول اکیڈمی بار اول 1959ء ص 33

انہوں نے " دیباچۂ حیات " کے آخر میں اس بات کی بھی وضاحت کی ہے کہ انہوں نے بعض مقامات پر کرداروں کے نام بدل دئیے ہیں - کیونکہ وہ ان واقعات کے اظہار سے کسی کی دلآزاری نہیں چاہتے تھے بلکہ انہوں نے صرف اور صرف معاشرے کے اظہار کے لئے ان واقعات کو رقم کیا -

جہان دانش جونہی منظر عام پر آئی لوگوں نے اسے سراہا - اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ احسان دانش نے اپنے زور بازو اور سعی پیہم سے اپنا مقام حاصل کیا وہ اقبال کے اس شعر کی جیتی جاگتی تصویر ہیں -

سہ مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

رئیس امروہوی لکھتے ہیں -

" میں احسان دانش کے رموز پر غور کرتا ہوں تو محو حیرت ہو جاتا ہوں - عصری تعلیم کے لحاظ سے امی واقع ہوئے ہیں لیکن نام نہاد تعلیم یافتہ افراد بھی تفکر اور تعقل کی ان وسعتوں کا احاطہ نہیں کرسکتے - جو اس مرد درویش اور قلندر دانش ور کو بطور عطیۂ وہبی نصیب ہوئی ہیں - وہ صرف نظم ہی کے میدان میں یکتا ویگانہ حیثیت کے مالک نہیں - ان کی نثر کی خوبی و دل نشینی کا اندازہ " جہان دانش "

(خود نوشت سوانح) کے مطالعہ سے ہو سکتا ہے ۔" ؎[1]

اشرف صبوحی کہتے ہیں ۔

" جناب احسان دانش مزدوروں کے بھٹوں اور بھٹیوں میں سے کندن بن کر نکلے ہیں ۔ ان کا کلام قال نہیں حال ہے اس لئے از دل خیزد و بر دل ریزد کے مصداق ہے ۔ مولانا حسرت موہانی کی طرح ان کی مشق سخن رہٹ میں بیل کی طرح جتنے اور مزدوروں کے ساتھ اینٹیں ڈھونے پر بھی جاری رہی ------ نظم میں تو مانے ہوئے استاد ہیں ۔ نثر میں بھی کسی سے کم نہیں ۔" ؎[2]

جوش ملیح آبادی لکھتے ہیں ۔

" آپ کے سوانح " جہان دانش " میں پڑھے ۔ بار بار پڑھے ۔ اور ہر بار نیا سرور حاصل ہوا ۔ آپ کی زندگی کے جان لیوا نشیب و فراز ۔ آپ کی خون میں ڈوبی صبحیں ، ہچکیوں میں غلطاں راتیں ایک ایک کر کے میرے سامنے آئیں اور دل مجبور ہوگیا

؎[1] ماہنامہ ۔ " جام نو " ۔ احسان دانش نمبر "
جلد 23 ۔ شمارہ 11 ۔ 12 ۔ 67 ۔ جے بلاک نمبر 2
پی ۔ ای ۔ سی ۔ ایچ سوسائٹی کراچی 29 ، ص 17

؎[2] ایضاً ص 17

آپ کے کردار کی چوکھٹ چوم لینے پر ---- آپ نے اپنی " شمعی " کا حال جس انداز سے لکھا ہے ۔ اس سے دل پر ایسی چوٹ لگی کہ آنسو نکل آئے ۔ طوائف کے گھر کی لڑکی اور ایسی بلند کردار یہ دراصل معجزہ ہے ۔" [1]

سر ظفر اللہ خاں ان الفاظ میں سراہتے ہیں ۔

" آپ نے سنگین مشکلات کے باوجود صرف اپنی محنت ، جفاکشی اور لگن کے بل بوتے پر اپنے لئے علم اور ادب میں جو مقام پیدا کیا ہے ۔ وہ اپنی جگہ داستان شجاعت سے کم نہیں ۔ " جہان دانش" کے مطالعے سے جہاں ہم آپ کی طویل کشمکش حیات سے آشنا ہوتے ہیں وہاں یہ سبق بھی حاصل ہوتا ہے کہ " ہمت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا ۔ مجھے یقین ہے کہ اردو دنیا میں بالعموم اور پاکستان میں بالخصوص آپ کی خود نوشت سوانح عمری بہت مقبول ہوگی ۔" [2]

ممتاز حسن کی رائے کچھ اس طرح ہے ۔

" آپ کی یہ خود نوشت سوانح عمری کئی ایک لحاظ سے منفرد ہے آپ نے زندگی کا اونچ نیچ دیکھا ہے ۔ کائنات اور انسان کی فطرت

---

[1] جام نو ماہنامہ ، احسان دانش نمبر ص 30

[2] ایضاً ص 32

سے قریب رہے ہیں اور ہر قسم کے تجربات کے باوجود آپ نے کسی واقعہ ،کسی مشاہدے کو بھی اپنی انسان دوستی کے راستے میں حائل ہونے نہیں دیا - اس پر زبان اور محاورے کی چستی سونے پر سہاگہ ہے -" [1]

مختار مسعود لکھتے ہیں -

" اس کتاب سے آپ کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے - میں تو کتنے ہی مقامات پر زیر لب آفرین کہتا رہا - یہ آفرین آپ کی ہمت مردانہ پر بھی ہے اور آپ کی نثر نگاری پر بھی -" [2]

حمید احمد خاں یوں رقمطراز ہیں -

" آپ نے اردو سوانح میں سچائی اور صاف گوئی کی مثال قائم کردی - نہ ریاکاری کا مبالغہ نہ وضعداری کی احتیاط - بس ایک کھرے انسان کی زندگی کی کہانی جس کی گونج دل میں دیر تک رہے گی - مرحبا -" [3]

1	جام نو ماہنامہ ، احسان دانش نمبر	ص 32
2	ایضاً	ص ۳۲
3	ایضاً	ص 33

سید حسام الدین راشدی کہتے ہیں۔

" یقین فرمائیے کہ اتنی دلچسپ اور سو فیصد سچی آپ بیتی میں نے اردو ادب میں نہیں پڑھی۔ بے کم و کاست آپ نے اپنے اور دوسروں کے لئے اپنے حالات اور احساسات بیان کردیے ہیں۔ میں نے سنا تو تھا کہ آپ نے مشکل ترین زندگی گذاری ہے لیکن یہ آپ بیتی پڑھ کر میں چونک گیا۔ آپ نے اس مرتبے تک پہنچنے میں کتنی بھیانک منزلیں طے کی ہیں۔ محنت اور مشقت اور ساتھ ہی استقلال کے ساتھ مصائب کو آپ نے کس بہادری سے جھیلا ہے۔ پڑھتے پڑھتے دل دہل جاتا ہے۔ اور آپ کی شخصیت کو چار و ناچار سلام کرنا پڑتا ہے۔" [1]

رئیس امروہوی لکھتے ہیں۔

" میں نے کبھی کسی کے سوانح کو اتنی دلچسپی سے نہیں پڑھا جتنی موانست اور دلچسپی اور انشراح صدر کا احساس جہاں دانش سے ہوا۔ یہ کتاب روشنائی سے نہیں روشنی سے لکھی گئی ہے۔" [2]

---

[1] جام نو ماہنامہ ، احسان دانش نمبر ص 33

[2] ایضاً ص 34

غلام جیلانی برق لکھتے ہیں ۔

" جہان دانش " پچھلے پچاس برس کی علمی و ثقافتی تاریخ
ہے ۔ مفصل نہ سہی مجمل ہی سہی ۔ اس سے ایسے نام اوراق
تاریخ میں محفوظ ہوگئے جنہیں دنیا شاید جلد بھول جاتی۔" [1]

اعجاز الحق قدسی کی رائے میں ۔

" کتاب کا ہر ورق بصارت اور بصیرت کے دریچوں کو وا کرتا ہے
اور چشم بصیرت کےلئے بہت سا سامان فراہم کرتا ہے ۔" [2]

اس سلسلے میں سید ضمیر جعفری یوں لکھتے ہیں ۔

" سوانحی ادب میں لطافت و حکمت کا ایسا امتزاج کم ہی دیکھنے
میں آیا ہے ۔ یہ کتاب لکھ کر آپ نے اردو زبان کے افق کو بھی
وسیع کیا ۔" [3]

سلطان رشک کی رائے اس بارے میں اس طرح ہے ۔

" میرا تاثر یہ ہے کہ اردو کے سوانحی ادب میں " جہان دانش "
ایک عظیم اضافہ ہے ۔ یہ ایسے شخص کی سوانح ہے جس نے
زندگی کو بہت قریب سے ، پوری ذمہ داری سے اور اس کی تلخیوں

---

[1] جام نو ۔ ماہنامہ ، احسان دانش نمبر ص 34
[2] ایضاً ص 35
[3] ایضاً ص 36

تنگیوں ، رعنائیوں اور پہنائیوں سمیت اسے قبول کیا - مایوسی اور
نا امیدی کو قریب بھی نہ آنے دیا اور پھر صاحب سوانح کا سب
سے بڑا کمال حقوق العباد کی ادائیگی میں ذمہ داری کا پورا پورا
احساس ہے میں سمجھتا ہوں کہ یہ کتاب جہد و عمل اور تحریک
کا جذبہ پیدا کرنے کا وسیلہ ہے اور نئی نسل کے لئے مشعل راہ -" [1]

ان آرا کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس کی (جہان دانش) اشاعت اول سے ہی اسے بھرپور پذیرائی ملی اور جہان دانش کو اسلوب اور حقائق کے بیان کی وجہ سے زبردست سراہا گیا -

اردو ادب میں اس سے قبل لکھی جانے والی باقاعدہ اور بے قاعدہ آپ بیتیوں میں " جہان دانش " کا مقام و مرتبہ جملہ ادبی حوالوں لفظ اور واقعہ کے انتخاب سے لے کر زبان و بیان کے ہر پہلو سے منفرد اور یکتا ہے - واقعات کی سچائی نے اسلوب کو کھرے پن اور تاثر کی بے مثال صورت عطا کر دی ہے - لکھنے والے نے پڑھنے والے کو اپنی زندگی کی وہ روشنائی عطا کر دی ہے کہ پڑھنے والا اپنی روشنی میں نہا گیا ہے - اس کی زندگی کے وہ گوشے جو اس سے قبل اس کے لاشعور میں بھی شائد نہیں آئے تھے شعور میں در آتے ہیں --- یوں " جہان دانش " احسان دانش کی زندگی کے ساتھ ساتھ اپنے قارئین کی زندگی

---

[1] جام نو - ماہنامہ ، احسان دانش نمبر ص 36

بھی اجاگر کرنے میں کامیاب نظر آتی ہے ۔ " جہان دانش " احسان دانش کی آپ بیتی بھی ہے اور اس کے عہد کی منتخب کہانی بھی ۔

****

" جہان دانش کی فہرست پر ایک نظر "

نمبر شمار		صفحات
1	انتساب	
2	فہرس	5
3	دیباچۂ حیات	11
4	وطن	17
5	آبائی ماحول	24
6	ایک حادثہ	27
7	رحیمن	30
8	تعلیم	33
9	لڑکپن کا ایک رجحان	39
10	ایک ہم سبق	42
11	انگریزی بال	43
12	سراجی	46
13	کھیتی	47
14	اسکول سے فرار	50
15	دو درویش	55

نمبر شمار		صفحات
16	دفینہ	58
17	باغبانی	60
18	رنگ سازی	62
19	قاضی محمد زکی صاحب	64
20	ایک خامی	68
21	ایک اور استاد	70
22	مرزا شفاعت بیگ	73
	عملی زندگی	
23	انسک مین	78
24	مہاجن کی نوکری	79
25	بیوپاری کی ملازمت	84
26	مزدوری	87
27	میرا عزیز پڑوسی	90
28	ایک مثالی مزدور	92
29	ایک مزدور ساتھی	95
30	بکری پالی	97
31	اصغر جنگ	97
32	سردار سوہن سنگھ	99
33	ایک خواب	99

نمبر شمار		صفحات
34	شہر کی مزدوری	103
35	ایک با اصول آقا	105
36	فصل کی کٹائی	110
37	ایک کمزور ساتھی	113
38	ایک میٹرک پاس مزدور	114
39	والد کی علالت	117
40	منافع خوروں کی ملازمت	117
41	وطن میں چپراس	124
42	نشہ بازاری	127
43	ایک واقعہ	127
44	آ گیا ہسپتال	131
45	ایک شکاری ساتھی	133
46	بزم شفیق	135
47	دو ساتھی	136
48	پلاؤ	139
49	دفتری چوکیداری	144
50	تیل کی چوری	145
51	کاندھلے کا ادبی ماحول	147
52	شادی	150

صفحات		نمبرشمار
152	مشاہدے کا چراغ	53
155	کیرانے کے دو شخص	54
157	شجاعت خاں بابر خاں	55
161	شمعی سے ملاقات	56
173	رقص کا تاثر	57
175	کانجی ہاؤس	58
181	استعفیٰ	59
184	آزادی کے چند روز	60
185	مضطر زخم	61
190	نیبو اندازی	62
197	غیر متوقع ملاقات	63
199	ایک ضیافت	64
	ترک وطن	
209	ترک وطن	65
212	روانگی	66
218	سیوا جی	67
221	شورش کاشمیری	68
227	پریشاں روزگاری	69
228	نامہ نویسی	70

صفحات		نمبر شمار
234	کتب فروشی	71
237	ایک رنگ ساز	72
242	شیروانی	73
247	میں یونیورسٹی میں	74
254	استاد ممتاز	75
258	مسطری نورالدین	76
259	چندا جمعدار	77
260	استادی	78
264	حسن	79
268	نیا سہارا	80
269	فاطمہ	81
270	شاہی قلعہ میں مزدوری	82
273	احاطہ بی بی پاکدامن	83
277	تلاش روزگار	84
278	ایک آواز	85
279	اردو پنجابی کا تقابلی احساس	86
281	مہرباں کیسے کیسے	87
290	شیراز گی	88
298	شمعی کا آخری خط	89
301	جاروب کشی کا ارادہ	90

نمبر شمار		صفحات
91	منافقین کا رویہ	304
92	سیر گاہ کی چوکیداری	305
93	ایک علم دوست	307
94	ذہنی مزدوری	311
95	چور پکڑا	312
96	مخلص مشیر	317
97	درزی خانہ	324
98	امرتسر کا ایک مشاعرہ	325
99	پہیلی جھر جھری	330
100	کپور تھلے کا مشاعرہ	335
101	ادبی ماحول	342
102	کراچی کا مشاعرہ	347
103	بساط ادب	352
104	گورنر ہاوس	354
105	سیماب دے دیا	360
106	نقل مکانی	362
107	معاصرانہ چشمک	365
108	ریلوے میں چپراس	369
109	کاندھلے کا ایک سفر	376
110	ایک خبر	377

نمبرشمار		صفحات
111	میرٹھ کا مشاعرہ	379
112	میری اہلیہ	383
113	لاہور کی نمائش کا مشاعرہ	387
114	م ۔ حسن لطیفی	391
115	مولانا تاجور نجیب آبادی	395
116	علامہ اقبال کے گھر	400
117	فیروز پور کا ایک مشاعرہ	403
118	حکیم نیر واسطی	404
119	بزم اردو شملہ کا مشاعرہ	414
120	سر عبدالرحیم اور نواب محمد اکبر خاں	417
121	ایک اور مشاعرہ	423
122	شعراء ادباء سے نزدیکی	425
123	میں اور علیگڑھ	430
124	زندہ در گور	433
125	میری نظموں کا تاثر	435
126	ایک دیوانہ وطن	438
127	بکڈپو کی ملازمت	445
128	دیوانہ بکار خود ھشیار	447
129	عجیب الخلقت بچہ	451

صفحات		نمبر شمار
452	دو لاشیں	130
459	سفر کلکتہ	131
465	آغا حشر	132
465	جمیل مظہری	133
466	ابراہیم ہوش	134
466	ایک رفیق راہ	135
469	ایک یادگار مشاعرہ	136
470	اختر حسین	137
477	ایک عبرت	138
478	حسب سابق	139
481	خاکساری	140
484	ایک استاد	141
486	میری شاعری کا ایک دور	142
489	بلیا کا مشاعرہ	143
492	ساحر قدوائی	144
494	نہلم کی سیاسی راہنمائی	145
500	بمبئی	146
506	ایک مشاعرہ	147
50[illegible]	حوصلہ مند والدین	148

نمبر شمار		صفحات
149	ایک ہندو دوست	510
150	علامہ مشرقی ایک پیش گو	512
151	لکھنو اور میں	514
152	توفیق حسین خاں	517
153	ایک سفر ریزہ	521
154	حدیث راہ	535
155	خواب دہلی	526
156	حضرت جوش ملیح آبادی سے پہلی ملاقات	533
157	والدہ سے جدائی	535
158	جناب نوح ناروی کا خلوص	538
159	زخم و مرہم	540
160	بزم اردو شملہ کا سالانہ جلسہ	544
161	ایک تعارف	547
162	صندل ہال کا مشاعرہ	550
163	ارباب ثلاثہ	553
164	خواش راہ	556

نمبرشمار		صفحات
165	لائل پور کاٹن ملز کے مشاعرے	565
166	والد صاحب کا اِنتقال	573
167	بھوپال کا مشاعرہ	577
168	حضرت شاہ فتح اللہ کا مزار	581
169	ہنگامہ راہ	585
170	ٹریفک کا ہفتہ	588
171	ادبی دید بان	590
172	آئینہ انحطاط	593
173	ایک موڑ	593
174	14 اگست 1947ء	595
175	اد بی پہلو	598
176	تقسیم ملک کا ہنگامہ	601
177	لاہور کے حکام	603
178	مردے ہی مرد ہے	604
179	ظفر ادیب	610
180	سردار کرپال سنگھ	611
181	مثالی دوستی	612
182	ایک بد گمانی	615

صفحات		نمبرشمار
618	اخلاقی مظاہرہ	183
620	زر راہ	184
621	جواں مرگ شجاع اللہ	185
630	تن ہمہ داغ داغ شد	186
634	سفر بمبئی	187
634	راجندر کرشن	188
636	ایک ذہینیت	189
640	یہ بیدرد لوگ	190
643	سانحہ رحلت	191
645	قائد ملت کی شہادت	192

احسان دانش نے اپنی داستان حیات میں 1948ء کے واقعات کو قلمبند کیا ہے اور اس کے آخر میں لکھا ہے ۔

" میں اپنی اس کتاب " جہان دانش " کی پہلی جلد یہیں تک رکھتا ہوں ! دوسری جلد میں حالات و واقعات کے ساتھ ان لوگوں کا ذکر کروں گا جن سے میں کبھی اور کسی بھی رخ سے متاثر ہوا ہوں ۔ ان میں بلا امتیاز مذہب و ملت شاعر ، ادیب ، تاجر ، طبیب ، حکام ، قائد ، مصور ، عالم

نقاد ، معلم ، پیرزادگان ، اور وہ فنکار بھی شامل ہوں گے
جو مجھے کسی بھی فن میں باکمال نظر آئے ۔" [1]

زندگی بہت سے واقعات کا مجموعہ ہے ۔ جس میں ہم مختلف لوگوں سے ملتے ہیں ان سے تعلقات استوار کرتے ہیں ۔ ان تعلقات کی نوعیت مختلف ہوتی ہے ۔ یہ فرد کا ایک الگ خانہ ہوتا ہے ۔ انسان جوں جوں آگے قدم بڑھاتا ہے اس کا میل جول بڑھتا چلا جاتا ہے ۔ اور یوں معاشرہ اس شخص کو بہت سے تعلقات کے بندھن میں باندھ دیتا ہے ۔ اس کا حلقہ احباب وسیع ہوجاتا ہے ۔ کاروبار حیات کو بڑھانے کے لئے وہ ہر طبقے اور ہر شعبے کے اشخاص سے رابطہ استوار کرتا ہے ۔ زندگی کے میلے میں بہت سے لوگ ملتے ہیں ۔کچھ تو ساری زندگی ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور کچھ اگلے موڑ پر مڑ جاتے ہیں ۔

احسان دانش کی زندگی میں بھی بہت سے لوگ آئے کچھ محنت مزدوری کے دنوں کے ساتھی اور کچھ علم کی راہ کے مسافر ، احسان دانش نے ان لوگوں کو فراموش نہیں کیا بلکہ ان سب کے ساتھ گذرے ہوئے لمحات اور دنوں کو اپنی اس خود نوشت سوانح عمری میں جگہ دی ہے ۔

ان کی وطن سے محبت بھی دیدنی ہے جب وہ " کاندھلہ " کا ذکر کرتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ خالق کائنات نے انہیں جس مٹی سے تخلیق کیا ہے وہ کاندھلے سے ہی لی گئی تھی ۔ کاندھلے کی ہوائیں

---

[1] احسان دانش ، " جہان دانش " ص 646

ان کی سانسوں میں بسی ہوئی محسوس ہوتی ہیں ۔

بچپن کے ساتھی ، تعلیمی دور کے ساتھی ، سکول کے دنوں کے ساتھی ، استاد ، مزدور ساتھی ، دوست ، حاسد ، عزیز رشتہ دار ، ماں باپ ، محبوبہ ، بیوی ، مشاعروں کے ساتھی ، ادیب و شعراء غرض ہر شخص ان کی نگاہ میں جو مقام و مرتبہ رکھتا ہے اس کا اظہار انہوں نے کردیا ہے ۔ وہ اپنی اس خود نوشت کا آغاز اس شعر سے کرتے ہیں ۔

چہ می پرسی سر و سامان من اے یار چوں گل

سیہ بختم ، پریشاں روز گارم ، خانہ بر دوشم

احسان حقیقتاً Self made انسان تھے انہوں نے اپنی زندگی کو اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے قدرت نے انہیں یقین ، ایمان ، ہمت ، لگن اور طاقت دے کر اس دنیا میں پیدا کیا اس کے علاوہ ان کے پاس کوئی مادی وسیلہ ایسا نہ تھا جو ان کو معاشرے میں مقام دلاتا ۔ احسان دانش نے جن حالات کا سامنا کیا ان حالات کی چکی میں اکثر انسان پس کر رہ جاتے ہیں اور زندگی کی دوڑ دھوپ میں اپنا صحیح تعین نہیں کر پاتے ۔ مگر احسان زندگی کی قدر و قیمت کے ساتھ ساتھ اپنی خوبیوں سے بھی آگاہ تھے ۔ انہوں نے ہاتھ کی مزدوری کے ساتھ ساتھ ذہنی مزدوری بھی کی اور اپنے جسم کی تھکن کو اپنے علم کے نور سے اتارنے کی کوشش بھی ۔ وسائل کی کمی کے باوجود ہمت اور لگن کے بل بوتے پر زندگی میں وہ مقام حاصل

کیا جس کو حاصل کرنے کے لئے بہت سے مادی وسائل راہ ہموار کرتے ہیں -

وہ صحیح معنوں میں محنت کی عظمت کے قائل تھے روپے کی غیر مساوی تقسیم پر ان کا دل کڑھتا تھا اپنے کام اور فن کی ناقدری دیکھ کر وہ پریشان ہوتے تھے لیکن ان کی انا اور خود داری نے انہیں عزم، حوصلے اور سربلندی سے جینا سکھایا - وہ زمانے کے آگے منت پذیر نہیں ہوئے بلکہ محنت اور لگن سے اپنے مشن پر لگے رہے - یونیورسٹی میں مزدوری کرنے والا احسان دانش اپنے علم اور محنت ہی کی بدولت اسی یونیورسٹی میں پی - ایچ - ڈی کے ممتحن کی حیثیت سے گیا وہ شخص جس نے چار جماعت تعلیم حاصل کی اس نے درس گاہ سے نکلنے کے باوجود خود اپنے علم کی پیاس بجھانے کے لئے پھولوں کی پتیوں سے قطرہ قطرہ شبنم حاصل کی - خود علم سے سیراب ہو کر وہ " مکتبہ دانش " قائم کرنے میں کامیاب ہوئے اور علم کے پیاسوں کی پیاس بجھانے کا سامان پیدا کیا -

احسان نے اپنی زندگی کے تجربات و مشاہدات کو اس خود نوشت سوانح عمری میں جس مقصد کے تحت سمویا تھا وہ مقصد بھی عظیم ہے - انہوں نے اپنے دشمنوں کو بھی محبت اور تشکر کا مستحق گردانا ہے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ ان دشمنوں کی بدولت وہ غفلت کی نیند سے جاگے - وہ کہتے ہیں " میں اپنے دھندلے دھندلے نقش حیات اس خیال سے پیش کر رہا ہوں کہ شاید یہ کسی نہ کسی نہج سے انسانیت کے لئے مفید ثابت ہوں -"

اس آپ بیتی کو پڑھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ " جہان دانش " ایک با مقصد آپ بیتی ہے جو مصنف کی ذات کی Projection کے ساتھ ساتھ قاری کو بھی خود احتسابی کی دعوت اور حوصلہ دیتی ہے ۔ اور نوجوان نسل کو اس بات کا حوصلہ عطا کرتی ہے کہ وہ سعی پیہم پر یقین رکھے تو خدا انہیں رسوا نہ کرے گا گو احسان دانش نے زندگی پھولوں کی سیج پر نہیں گذاری لیکن غالب کا یہ شعر ان پر صادق آتا ہے ۔

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج

مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پہ کہ آساں ہوگئیں

" جہان دانش " کو پڑھ کر کہیں بھی بناوٹ اور جھوٹ کا احساس نہیں ہوتا ۔ اس میں بچپن کی معصومیت ، جوانی کا سرور ، لڑکپن کی شرارتیں ، زندگی کی مشکلات ، راہ عشق کا سفر ، خانگی و عائلی ضروریات ، معاشی و معاشرتی ذمہ داریاں ، علم کی تلاش ، روح کی آسودگی ، زندگی کے تلخ حقائق ، معاشرے کی تصویریں ۔ غرض ہر چیز دکھائی دیتی ہے اور اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ احسان نے زندگی کے حوادث کا مقابلہ بہت جرات و بہادری سے کیا ہے ، اور وہ بھی یوں جیسے کہ زندگی بھی ان پر نازاں دکھائی دیتی ہے ۔

*****

باب پنجم

"جہان دانش" کا فنی مطالعہ

باب پنجم

"جہان دانش کا فنی مطالعہ"

جہان دانش کا فنی مطالعہ کرنے سے پہلے ہم گذشتہ ابواب کو دہراتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ "جہان دانش" آپ بیتی کے فن پر کس حد تک پوری اترتی ہے۔ ابھی تک گذشتہ ابواب میں جو باتیں کہی گئی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ خود نوشت سوانح عمری میں انسان خود اپنی زندگی کے واقعات کو رقم کرتا ہے اور ان ڈھکے چھپے گوشوں سے نقاب ہٹاتا ہے جن سے دوسرے لوگ واقف نہیں ہوتے۔ وہ خود اپنی زندگی میں اٹھائے والے مصائب اور مشکلات، حالات و واقعات کا احساس جس حد تک رکھتا ہے دوسرے نہیں رکھتے۔ وہ اپنی زندگی کے نشیب و فراز کو خود قلمبند کرتا ہے۔ اس میں سچ کے ساتھ ساتھ اور بھی بہت سی باتوں کا خیال رکھتا ہے تا کہ قارئین کی دلچسپی برقرار رہے اور آپ بیتی لکھنے کے مقاصد بھی حاصل ہو جائیں۔ وہ اپنی اس تحریر کے ذریعے اپنی زندگی کے اہم واقعات کو مربوط لڑی میں پرونے کی سعی کرتا ہے۔

آپ بیتی لکھنے کے لئے جو باتیں اہم ہیں ان کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

1۔ آپ بیتی صیغہ واحد متکلم میں لکھی جاتی ہے یعنی آپ بیتی لکھنے والا اپنے لئے "میں" کی ضمیر استعمال کرتا ہے۔

2 - آپ بیتی لکھنے والے کا اسلوب عام فہم دلچسپ اور سادہ ہونا چاہئیے۔

3 - آپ بیتی با مقصد اور معلوماتی ہونی چاہئیے تا کہ قارئین مصنف کی زندگی کے ساتھ ساتھ اس عہد کے جملہ سیاسی سماجی معاشرتی ، تہذیبی اور ثقافتی پس منظر سے بھی آگاہ ہو سکیں ۔

4 - آپ بیتی نہ تو بے حد طویل ہو کیونکہ اس صورت میں اس کا تاثر پھیکا پڑ جائے گا اور نہ ہی بے حد مختصر ہونی چاہئیے کیونکہ اس طرح سے اس میں ابہام پیدا ہوگا جو اس کے مقصد کے حصول میں رکاوٹ بن جائے گا ۔

5 - آپ بیتی میں صرف دلچسپی کی حد تک تخیل آمیزی ہونی چاہئیے ۔ اور اس میں واقعیت اور حقیقت نگاری کا پہلو نمایاں رہنا چاہئیے ۔

6 - آپ بیتی نگار کا مطالعہ وسیع ہونا چاہئیے اور زبان و بیان پر اس کی مکمل گرفت ہونی چاہئیے ۔

7 - آپ بیتی نگار کا مشاہدہ عمیق ہونا چاہئیے اور زبان عمدہ ہونی چاہئیے ۔

اب ہم اس مختصر اعادہ کے بعد جہاں دانش کا فنی مطالعہ کرتے ہیں ۔ احسان دانش نے " جہاں دانش " صرف زندگی کے واقعات کو صفحہ قرطاس پر منتقل کرنے کے لئے نہیں لکھی اور نہ ہی بلا ارادہ لکھی ، وہ لکھتے ہیں ۔

" یہ کتاب " جہاں دانش " جو آپ کے سامنے ہے میں نے اسے کئی بار لکھنے کا ارادہ کیا لیکن اپنے حالات کی طرف دیکھ کر اس خیال سے

خاموش ہوگیا کہ کہیں پڑھنے والے اسے رحم کی درخواست نہ سمجھ
لیں ---- لیکن اب کچھ دنوں سے خود کو دنیا کا مقروض سا خیال
کر رہا ہوں اس دنیا کا جس نے مجھے کسی طرح بھی سہی یہ
شعور دیا ہے کہ میں اپنے محسنوں ، دوستوں اور ساتھیوں کا شکر
گذار ہو سکوں ---- مجھے کبھی کسی سے کوئی شکایت نہیں رہی ،
دشمنوں کو بھی میں نے محبت اور تشکر کا مستحق گردانا ہے کیونکہ
انہوں نے بھی مجھے غفلت سے جگایا اور آنکھیں دی ہیں -" [1]

اس اقتباس کو پڑھ کر بہت سی اہم باتیں واضح ہو جاتی ہیں مثلاً یہ کہ یہ خود نوشت محض احسان دانش کی یاد داشت نہیں بلکہ زندگی کی کتھا ہے۔ جس میں گذرے ہوئے ایام کی وہ سب باتیں درج ہیں جو یاد رکھنے کے قابل ہیں اور جنہیں بھلانا یا نظر انداز کر دینا ان کے بس میں نہیں - انہوں نے اپنی زندگی کے واقعات کو اسی رنگ میں پیش کیا -

انہوں نے آپ بیتی کی روایت کے مطابق ضمیر واحد متکلم استعمال کی ہے۔

" مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ افلاس کے اس اندھیرے میں اگر
علی الصبح کھانے کا بندوبست نہ ہو سکتا تو میرے والد دوپہر تک
کہیں سے ادھار سدھار لے کر اسکول میں کھانا پہنچاتے اور میں مدرسے

---

[1] احسان دانش ، " جہان دانش " ص 11

کی برابر والی مسجد میں گھر سے آئی ہوئی روٹی بھوک میں اندھے
بادلوں کی طرح کھاتا ۔ کئی بار میں نے یہ بھی دیکھا کہ میرے لئے
اسکول میں گیہوں کے آٹے کی روٹیاں بھیجی گئی ہیں اور ماں باپ
نے جب اپنے لئے آٹا کم دیکھا تو " بھتوا " ابال کر پیس لیا اور
آٹے میں ملا کر نمک مرچ کی آمیزش سے روٹیاں پکا لیں تا کہ حلق
سے اتر سکیں ۔ کبھی کبھی مدرسے سے واپسی پر اس روٹی کا بچا
کھچا ٹکڑا مجھے بھی مل جایا کرتا ۔ اور میں مزے لے لے کر کھاتا ۔
مجھے وہ بڑا مزیدار لگتا ۔ کیونکہ اس وقت میری زبان دنیا کی رنگ
برنگ نعمتوں اور طرح طرح کے چٹخاروں سے آشنا نہ تھی ۔" سہ[1]

اس اقتباس کو پڑھ کر قاری ان کے حالات سے آگاہ ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ زبان وبیان کی دلچسپی اسے مجبور کرتی ہے کہ وہ مصنف کی بات کو سچ مان لے ۔ انہوں نے اپنی زندگی کے واقعات اس طرح سے بیان کئے ہیں ۔ کوئی بات بھی چھپی ہوئی محسوس نہیں ہوتی ، عسرت تنگدستی ، معاشی بدحالی ، شبانہ روز محنت ہر چیز کا کھلے دل سے اعتراف " جہان دانش " کی اہم خوبی ہے ۔

احسان دانش کی اس کتاب حیات میں ان کی زندگی کے مصائب و شدائد کے واقعات بکھرے پڑے ہیں ، انہوں نے بچپن میں ہی افلاس کا ذائقہ چکھ لیا تھا ، وہ خالی پیٹ مدرسے جاتے تھے اور بے قرار ماتا کی ماری ماں اور

سہ[1] احسان دانش ، " جہان دانش " ص 67 تا 68

والد ایسے وسائل اور حیلے تلاش کرنے میں جت جاتے کہ جس سے یہ امید بندھ جائے کہ کہیں نہ کہیں سے ان کے بچے کے لئے روٹی کا انتظام ہو جائے گا۔

احسان دانش نے اپنے بچپن کے حالات بیان کرتے وقت ان چوریوں کا اعتراف بھی قاری کے سامنے کھلے دل سے کیا ہے جن کو باآسانی چھپا سکتے تھے لیکن انہوں نے آپ بیتی کے فنی خلوص کو مد نظر رکھتے ہوئے ان کو چھپایا نہیں ہے بلکہ ان کو اس طرح سے بیان کیا ہے کہ قاری ان کی معصومیت پر حیران رہ جاتا ہے۔

" جب میں جین مندر کی طرف سے گھر آتا تو مجھے دور تک آسا رام نامی لڑکے کے ساتھ باتیں کرنے کا موقع ملتا ---- بلا کا ذہین اور متین ہونے کے علاوہ خوش پوش اور خوش گل واقع ہوا تھا۔ وہ کوشش کرکے اسکول میں میرے برابر بیٹھا کرتا اور دوستانے میں مجھے سوال نقل کرایا کرتا۔ ہوتے ہوتے مجھے اس چوری کی ایسی عادت ہوئی کہ اگر کسی دن کوئی لڑکا بیچ میں بیٹھ جاتا تو میں لڑکر اسے اٹھا دیتا ابھی تک مجھ میں وہی خامی چلی آتی ہے کہ حساب سے جی چراتا ہوں۔ حالانکہ صرف ریاضی پر میری دس کتابیں " الحساب" کے نام سے ہیں۔" [1]

" جہان دانش " میں ہمیں احسان دانش کے عہد کی عصری تصویریں بھی دکھائی دیتی ہیں اور ان کے عہد کے سیاسی و سماجی حالات کی جھلکیاں بھی۔

---

[1] احسان دانش ، " جہان دانش " ص 68

وہ اپنے مولا کاندھلہ پر نازاں دکھائی دیتے ہیں جس کی مٹی سے انہیں وفا اور خلوص کی خوشبو آتی ہے جس کی فضا میں سانس لینے والے لوگ بکنے جھکنے والے نہیں بلکہ انمول ہیں اور جو 1857ء کی جنگ آزادی میں تماشائی نہیں بنے رہے بلکہ انہوں نے اپنے خون سے اس جنگ آزادی کو سینچا تھا۔ کاندھلے کے لوگ وطن سے محبت کرنے والے پرخلوص اور جاں نثار لوگ ہیں۔

" کاندھلے کے علماء و فضلاء کی تصانیف اور کارنامے اس کے شاہد ہیں کہ کاندھلے میں خود فروش عالم اور قوم فروش لیڈر پیدا نہیں ہوتے۔ کاندھلے کے علماء کے خون سے غدر میں سینکڑوں پھانسیوں کے تختے رنگے گئے۔ اور اب تک کاندھلے کے لوگوں میں خلوص اور جاں نثاری اسی طرح شاداب و شگفتہ ہے۔" [1]

احسان دانش نے کسی بند مکان کی کھڑکی یا کسی محل کے روزن سے زندگی کے تلخ حقائق کا مشاہدہ نہیں کیا بلکہ وہ زندگی کی آگ میں جل کر آگ ہوچکے تھے اور انہوں نے ان دکھوں اور پریشانیوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ان کا مقابلہ کیا تھا۔ بچپن سے لے کر جوانی تک اور جوانی سے بڑھاپے تک کے اس سفر میں بہت سے اتار چڑھاؤ آئے لیکن دکھ اور پریشانیوں کی چادر نے ہمیشہ ان پر اپنا سایہ کئے رکھا۔

تقسیم وطن کے واقعات کو انہوں نے اس طرح سے بیان کیا ہے کہ ہر ہر ہر سطر دکھ ٹپکتا محسوس ہوتا ہے اور بھارت کے اس جھوٹے سیکولرازم کا

---

[1] احسان دانش ، " جہان دانش " ص 23

بھانڈا پھوٹ جاتا ہے جس کا وہ نعرہ بلند کرتا ہے - انہوں نے اس وقت ہونے والی قتل و غارت گری کی اس طرح سے تصویر کھینچی ہے کہ وہ تصویر اب بھی لو دینے لگتی ہیں -

" تقسیم ملک کا ہنگامہ جالندھر میں قیامت کا نمونہ بنا ہوا تھا - آگ اور خون کے دیوتا چنگھاڑ رہے تھے - مسلمانوں کے خون سے ہندو سیاست کی بنیادیں بھری جا رہی ہیں - دیہات کے جابر سکھوں اور چالاک ہندوؤں نے مذہب اور انسانیت کے اصولوں کو پس پشت ڈال کر پردہ نشین عورتوں ، اور بچوں کے قتل سے بھی دریغ نہیں کیا - چنانچہ گلی گلی میں مسلمانوں کو قتل کرنے کے لئے مقتل مقرر ہوگئے تھے - ادھر ادھر قتل ہونے والے مسافر اور غریب الوطن مقتول سڑکوں باغوں اور ریلوے لائن کے آس پاس بکھرے پڑے تھے - چیلیں اور کوے انسانی گوشت کھا کھا کے چھک چکے تھے اور اب جنگلوں میں ایسا تعفن پھیل رہا تھا جیسے دو ناپاک اور ایذارساں مادوں میں کشا چھپی ہوگئی ہو - مگر جذبہ غارتگری تھا کہ ختم ہونے میں نہیں آتا تھا -" [1]

احسان دانش نے اپنی اس خود نوشت سوانح عمری کو غیر ضروری طوالت اور غیر ضروری اختصار سے بچایا ہے - انہوں نے اس میں اپنی زندگی کے اہم واقعات

---

[1] احسان دانش ، " جہان دانش " ص 612

کو جگہ دی ہے - لکھتے ہیں -

" بعض واقعات کو میں نے ماضی کے تہ خانے سے جھاڑ پونچھ کر نکالا اور وہ جھلکار بھی دینے لگے ، مگر طوالت و ضخامت کے خیال سے شامل کتاب نہیں کیا - اگر ضرورت ہوئی تو دوسرے ایڈیشن یا دوسری جلد میں شامل کردوں گا - ان کی تعداد بھی کم نہیں بعض جگہ حالات کا توارد بھی ہوا لیکن میں نے پروا نہیں کی -" [1]

انہوں نے جہان دانش کے آغاز میں ہی یہ بات واضح کردی ہے کہ وہ واقعات کی ترتیب میں کہیں کہیں بھٹکے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا ہے کہ انہوں نے اپنی اس خود نوشت سوانح عمری میں سنین کا اہتمام نہیں کیا - یہ کوئی لا شعوری حرکت نہیں بلکہ انہوں نے شعوری طور پر سنین کا اندراج نہیں کیا - جس کی دو وجوہات ہیں اول یہ کہ انہیں اس بات کا اعتراف ہے کہ انہیں ہندسہ اور راستہ دونوں یاد نہیں رہتے اور نہ ہی انہوں نے کبھی انہیں یاد رکھنے کی کوشش کی ، دوئم یہ کہ انہوں نے " جہان دانش " کی صورت میں کوئی تاریخ کی کتاب مرتب نہیں کی بلکہ اپنی زندگی کے دھندلے دھندلے نقوش حیات پیش کئے ہیں اور اس لئے بھی کہ شاید یہ کسی رخ سے انسانیت کے لئے مفید ثابت ہوں - اس سے زیادہ ان کے نزدیک کوئی دوسرا فائدہ یا مقصد نہ تھا - وہ خلوص کو انسانیت کا زیور قرار دیتے ہیں - اسی لئے وہ راستہ سیاست اور مذہب کے

---

[1] احسان دانش ، " جہان دانش " ص 12 - 13

اپچ بیچ سے دو رہے اور وہ باتیں بیان کیں جو اس دنیا کے لوگوں میں خلوص اور محبت کے جذبے کو پروان چڑھائیں - اس سلسلہ میں ڈاکٹر سید عبد اللہ لکھتے ہیں -

" میں بہ حیثیت مجموعی جہان دانش کی چند خصوصیات تک پہنچا ہوں - جن کی بنا پر اسے منفرد کہہ سکتا ہوں - ایک خصوصیت تو یہی پاس ناموس عشق ہے جس کا میں نے ذکر کیا ہے - دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک غریب مزدور کی پر خلوص اور بہادرانہ جد و جہد کی کہانی ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ غربت کتنی بڑی مصیبت ہے اور دولت کس کس انداز سے شرف انسانی پر ڈاکے ڈالتی اور اپنے لئے پندار کے محل تعمیر کرتی رہتی ہے - دولت مند لوگ انسان کی کھال میں بھیڑیے کیوں بن جاتے ہیں اور تقدس کے ہر ہر مظہر کو بے آبرو کیوں کرتے ہیں - بس یہ ہی نکتہ جہان دانش کا ماحصل اور اس کے اندر کے وہ معنی ہیں جن کی بنا پر یہ " جہان دیگر " بن گئی ہے اس میں افکار و تصورات بھی ہیں اور عقیدے اور تجربے بھی- اور سب ایسے جو ایمان و ایقان کے چراغ روشن کر رہے ہیں ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ زمانے کے ادب و معاشرت کی تصویریں بھی ہیں اور ان ممتاز افراد کی سیرت بھی دکھائی گئی ہے جن سے مصنف کو واسطہ پڑا - تیسری خصوصیت مصنف کا خدا اور اسلام پر گہرا یقین ہے- چوتھی خصوصیت مصنف کی انسان شناسی ، احساسات و تصورات کی مصوری

اور کردار کے داخلی نقوش کی نقشہ نگاری ۔ پانچویں خصوصیت وہ فضا سازی ہے جو اس کتاب کو ناول کے مانند ادب پارہ بنا رہی ہے ۔ چھٹی خصوصیت اس کا دلکش اور منفرد اسلوب بیان ہے جو نثر میں شاعری کی ادا پیدا کر رہا ہے اور آخری بات جس نے جہان دانش کو ایک حکیمانہ کتاب بنا دیا ہے کہ اس میں قدیم حکما اور دانش مندوں کے طریقے پر حکمت ودانش کے بلیغ فقروں میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ ہر فقرہ ضرب المثل بننے کے قابل ہے۔" [1]

احسان کی داستان حیات کوئی چونکا دینے والی پر تجسس کہانی نہیں ہے لیکن اس کتاب میں وہ حقائق موجود ہیں جو ان کا ذاتی تجربہ اور مشاہدہ ہیں ۔ احسان دانش ایک Salfmade انسان تھے حالات کی بھٹی میں تپ کر کندن بنے وہ اپنے حالات پر خدا سے شکوہ نہیں کرتے لیکن صاحب دل ہونے کی وجہ سے اس بات پر اکثر سوچتے ہیں کہ معاشرے کے اس طبقے کے اوقات اس قدر تلخ کیوں ہیں اور انہیں ان کی محنت اور مشقت کا صلہ اس قدر کیوں نہیں ملتا جس سے ان کی بنیادی ضروریات پوری ہو سکیں ۔

شاعری احسان کی رگ رگ میں سمائی ہوئی تھی ۔ معاشی تنگدستی کے باوجود وہ مناظر کا حسن اپنے اندر سمو لیتے تھے قدرت کے حسن کو اپنی نظر میں

---

[1] عبداللہ ، سید ، ڈاکٹر ۔ " وجہی سے عبدالحق تک "
لاہور مکتبہ خیابان ، بار دوم 1977 ء ، ص 331 ۔ 232

اتارنے کا وصف بھی قدرت نے انہیں دے رکھا تھا ۔ جہان دانش کو پڑھ کر احساس ہوتا ہے ۔ کہ خدا نے انہیں حسن شناس نظر عطا کی تھی ۔ جہان دانش کی فضا سازی قابل تحسین ہے انہوں نے اپنے خارجی ماحول کی مصوری ایک ماہر مصور کی طرح کی ہے ۔ غربت کے دنوں کی تصویر کشی ہو یا بازار حسن کا منظر ، مزدوری کی کھتا ہو یا مشاعرے کی فضا ، گورنر ہاوس کے سبزہ زار کی روداد ہو یا ریل کے سفر کی کیفیت ان سب کی منظر کشی وہ اس طرح کرتے ہیں کہ قاری اتنا عرصہ گذر جانے کے باوجود خود کو احسان کے ساتھ ساتھ محسوس کرتا ہے ۔

" جہان دانش " ایسے بے شمار منظروں سے بھری پڑی ہے ۔ جن سے ہماری نظر دو چار ہوتی رہتی ہے لیکن اس میں اتنی وسعت نہیں ہوتی جس وسعت سے احسان کی نظر ہمکنار تھی ، انہوں نے اپنے شاعرانہ تخیل سے منظر کو چار چاند لگا دئیے ہیں ۔

قدرتی حسن کی تعریف کرتے ہوئے وہ سراپا حمد دکھائی دیتے ہیں ۔ خوبصورت استعارات اور تشبیہات نے " جہان دانش " کو دلکش اور قابل فہم بنا دیا ہے انہوں نے اپنی زبان دانی کا کہیں پر بھی دعوی نہیں کیا لیکن خوبصورت جملوں کا انتخاب اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ جہان دانش "احسان دانش کے علم و فضل اور تجربے کا نچوڑ ہے ۔ ملاحظہ ہوں یہ اقتباسات ۔

" سامنے کے مناظر کھیت ، جنگل ندی ، نالے اور راستے کی مخلوق ہی مجھ میں سمائی جا رہی تھی ۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے

میں ان آنکھوں سے اس کائنات کو پی رہا ہوں اور ذرہ ذرہ سینے میں محفوظ ہو رہا ہے ۔ " [1]

" سنہری روشنی میں دور کی برف پوش چٹانیں شیشے کی پگھلتی ہوئی فصلیں دکھائی دیتی تھیں ۔ " [2]

" بجلی کے پول پر نکلتا ہوا سورج ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے شاہوں کے نیزے پر حسین کا مقدس چہرہ " [3]

" جب گرمی کا موسم شباب پر ہوتا تو نارنجی پھولوں سے جنگل بھر جاتا اور ایسا معلوم ہوتا کہ ڈھاک کی ہر شاخ پر شعلے آپس میں سرگوشیاں کر رہے ہیں ۔" [4]

" افق بعید سے بادل کی گڑگڑاہٹ مسلسل آ رہی تھی جیسے آسمانی پہاڑوں میں کوئی فرقہ وارانہ فساد ہوگیا ہے ۔ چٹانیں لڑ رہی ہوں اور قوت و جبروت کے فرشتے ان کی ہڈیاں توڑ رہے ہوں ۔" [5]

" درختوں کے سائے میں تیز ہوا آنکھیں ملتے خود رو گھاس کو ہلکی ہلکی پینگیں دے رہی تھی جیسے سوتے میں بچوں کی انگڑائیاں ۔" [6]

---

1. احسان دانش ، "جہان دانش " ص 578
2. ایضاً ص 553
3. ایضاً ص 553
4. ایضاً ص 182
5. ایضاً ص 194
6. ایضاً ص 195

"مجھے ان پودوں سے مل کر مسرت ہوتی جنہیں میں پانی دے کر
سانس لیتا تو ایک توانائی سی ملتی جیسے میرے رگ و ریشے میں
مومیائی سرایت کر رہی ہے۔" [1]

"چاند سفیدے کے پیڑ کی چوٹی سے ذرا ابھر چلا تھا جیسے کسی
حسینہ نے کوٹھے پر چڑھتے ہوئے زینے کی آخری سیڑھی پر سیاہ برقع
کا نقاب الٹ دیا ہو۔" [2]

انیس امروہوی لکھتے ہیں ۔

اس صحیفے کا ہر اک باب انیس — دفتر درد کشان دانش
کتنا شائستہ ہے انداز بیاں — کتنی شستہ ہے زبان دانش
ایسا صانع کہ تصنع سے بری — بے تکلف ہے بیان دانش
وسعت لفظ و بیاں سے بالا — نشئہ لفظ و بیان دانش

دانش اہل جہاں کا حاصل
چشم دانا میں جہان دانش [3]

---

[1] احسان دانش ، "جہان دانش" ص 309
[2] ایضاً ص 312
[3] انیس امروہوی ۔ "جہان دانش" ماہنامہ جام نو ۔ احسان دانش نمبر ۔ شمارہ 11 ۔ 12 ۔ جلد 33 ۔ کراچی
ص 305 ۔ 306

حکیم راغب مراد آبادی لکھتے ہیں -

فقر و فاقہ میں بھی لب پر نہ شکایت آئی
شکر ایزد ہی رہا ورد زبان دانش

کس کو دانش کے مصائب کا ہے علم کامل
کون ہے با خبر سود و زیان دانش

بارہا دولت دنیا نے پکارا لیکن
علم و دانش ہی رہے روح و روان دانش

سر بلندی کے لئے کون مزدور کی وقف
کیوں نہ لہرائے بلندی پہ نشان دانش

ذکر اقبال و ظفر تذکرہ شورش و جوش
ایک دنیائے ادب ہے یہ " جہان دانش "

واقعات اس میں کم و بیش وہی ہیں راغب
میں نے پہروں جو سنے ہیں بزبان دانش
لہ 1

ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں -

" خود نوشت کے بارے میں کسی صاحب نظر نے کہا ہے کہ آدمی کچھ اور کرے یا نہ کرے لیکن اسے اپنی خود نوشت ضرور لکھ جانا چاہئیے اس میں دو خاص نکتے ہیں - ایک تو یہ کہ اس طرح ہر شخص کی

لہ 1 حکیم راغب مراد آبادی - " تاثرات منظوم " احسان دانش نمبر شمارہ 10 / 12 جلد 33 کراچی - ص 306 - 307

زندگی کے مشاہدات و تجربات جو دوسروں سے بہر حال مختلف ہوتے ہیں ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جائیں گے ۔ آئندہ نسلیں ان سے بقدر لب و دنداں اپنا کام نکالیں گی ، چراغ سے چراغ جلے گا ۔ راہ سے راہ نکلے گی ۔ اور زندگی کی کٹھن منزلیں آسان ہو جائیں گی ۔ دوسرے یہ کہ خود نوشت لکھنے والا مر کر بھی زندہ رہے گا ۔ اس کے نظریات و افکار ہر نسل اور ہر عہد کے انسان کو مرنے والے کی یاد دلاتے رہیں گے ۔ ایسے میں کون ہے جس کے دل میں اپنی خود نوشت لکھ جانے کا شوق پیدا نہ ہو۔" [1]

جہان دانش کا مطالعہ کریں تو یہ دونوں نکتے جن کا ذکر ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے کیا ہے ہمیں جہان دانش میں نظر آتے ہیں ۔ آج کی موجودہ نسل جہان دانش کو پڑھ کر سوچ سکتی ہے کہ اگر کسی شخص کو دنیا میں اپنا مقام بنانا ہے تو سب سے پہلے کڑی محنت کو اپنا شعار بنائے ۔ رزق حلال کمائے ۔ اپنے زور بازو پر بھروسا کرے ۔ امید اور ایمان کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے خود اپنا محتسب بن جائے تو پھر قدرت بھی ایسے شخص کی ہمت کی داد دیتی ہے ۔

احسان دانش ایک ایسے انسان تھے جنھیں قدرت نے اوسط درجے سے بھی کمتر ماحول دیا اور وراثت میں افلاس کا ڈھیر دیا ۔ جس کی وجہ سے وہ

---

[1] فرمان فتح پوری ، ڈاکٹر ، "احسان دانش " جہان دانش کی روشنی میں" جام نو ۔ احسان دانش نمبر ص 309

ایک عظیم مزدور راسخ العقیدہ مسلمان ، زندگی کی جنگ میں ایک مجاہد اور انسانوں کے میلے میں پر خلوص انسان دوست ہمدم ، ادبی دنیا میں ایک حقیقت پسند شاعر اور ادیب کی حیثیت سے متعارف ہوئے ۔

" جہان دانش " احسان دانش کی ایسی تخلیق ہے ۔ جس سے ان کا ماضی اور حال عیاں ہوتا ہے ۔ وہ زندگی کی بھٹی میں تپ کر نکلنے والا کندن ہیں ۔ جس میں کسی قسم کا کھوٹ دکھائی نہیں دیتا ۔ اور اس کندن کی آب و تاب جہان دانش کے حرف حرف سے جھلکتی ہے ۔ اور اسی وجہ سے حکومت اور عوام کے ساتھ ساتھ گلڈ نے بھی ادبی انعام کا مستحق ٹھہرایا ۔ اہل نقد و ادب نے بھی اس کی مثبت خوبیوں کی وجہ سے اسے سراہا ہے اور احسان دانش کی زندگی میں ہی اس کتاب کو سراہا گیا اور کسی نے بھی ان کے رقم کردہ کسی ایک واقعہ کو بھی جھوٹ قرار نہیں دیا ۔

جمیل احمد عدیل یوں رقمطراز ہیں ۔

" احسان دانش کی مشہور کتب میں سب سے اہم ان کی آپ بیتی ہے اس کا ایک سبب ان کے اسلوب کی رعنائی بھی ہے ۔ وگرنہ قصہ مظلومیت صرف بیان کے معاملہ میں ذرا سی بے احتیاطی کے سبب سوز خوانی کی مجلس بن کے رہ سکتا ہے ، مگر احسان تو لفظیات اور کیفیات کا اس قدر گہرا شعور رکھتے ہیں کہ انہوں نے ہر کیفیت کے حسب حال جملے تراشے ہیں ۔ مگر کہیں بھی ان کے ہاں تصنع موجود نہیں اور اس کا سبب یہی ہے کہ ان کے تجربے میں خلوص اور ان کے اظہار میں صدق

ہی صدق ہے ۔ جہان دانش کے مبصرین نے اس آپ بیتی کے اسلوب کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہی بتائی ہے کہ زندگی کی ہر تڑپ اور مشاہدے کی ہر تحریک احسان کو کائنات میں پھیلی ہوئی جان دار و بے جان مشابہتوں کی طرف مائل کردیتی ہے ۔" [1]

" درخت زعفرانی پتوں کی فرغل پہنے کھڑے ہیں اور روشوں پر رنگ برنگ کی مکھیاں سبز پتوں کی اوڑھنیوں میں منہ لپیٹے شہنیوں پر جھول رہی ہیں ۔" [2]

" سرو کی چوٹی پر مسکراتا ہوا سورج دار پر منصور کے چہرے کی طرح جھلک رہا تھا ۔" [3]

احسان دانش ساری زندگی طالب علم رہے ان کی طلب سچی تھی اور ان کی لگن حقیقی معنوں میں اس منصب کی متلاشی تھی جس منصب کو انہوں نے اپنی شبانہ روز محنت سے پایا ۔ گھر کے برتن بیچ کر والدین نے چوتھی جماعت تک تعلیم دلائی اور پھر اس طالب کی کسی اور سکول تک رسائی نہ ہوسکی لیکن وہ زندگی کے ہر تجربے سے علم کشید کرتا ہے ۔ بکریاں چرانے کی مشقت اور رہٹ پر بیل کا کام کرنے کے دوران بھی اس کی طلب میں کوئی کمی نہیں آتی ۔ جسمانی مشقت کرنے کے بعد اپنے

---

[1] جمیل احمد عدیل ۔ سیاق و سباق لاہور ممیز پبلیشرز بار اول 1995 ء ص 63 - 64

[2] احسان دانش "جہان دانش" ص 355

[3] ایضاً ص 357

ذہن کی آسودگی اور سکون کے لئے انہوں نے کتابوں میں پناہ ڈھونڈی ۔
" والدین " " شمعی " " رزق حلال " " کتابیں " شعر گوئی ان کی زندگی کا
محور نظر آتی ہیں ۔

" جہان دانش " کو پڑھنے کے بعد اردو زبان کی وسعت اور ہمہ گیری
کا احساس ہوتا ہے اس میں ایسے نئے الفاظ ، اچھوتی تراکیب ، اور محاورات
ملتے ہیں جن سے بصیرت و بصارت پہلے آشنا نہ تھی ۔

سید حسام الدین راشدی لکھتے ہیں ۔

" میرے بس میں ہوتا تو یہ کتاب نصاب میں شامل کراتا تا کہ پاکستانی
نوجوان جو سہل پسندی سے زندگی کے راستے پر گامزن ہیں اور اس کا
آئیندہ معلوم نہیں ۔ اس کو پڑھے اور دیکھے کہ ایک فنکار اور انسان
بننے کے لئے کتنے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں ۔" سہ[1]

غلام جیلانی برق لکھتے ہیں ۔

" کتاب کی زبان سلیس رواں اور فصیح ہے آپ نے پاکستانی اردو میں
سینکڑوں ایسے الفاظ کا اضافہ کیا ہے جو کاندھلہ و نواح کاندھلہ سے
مخصوص تھے اور جن سے ہمارے کان نا آشنا تھے مثلاً آکھر ، اکھوا
نا ہوت ، ترمدے ، شتر ، کھوسن ، ہماوٹ ، اولتی ، تل چاولی ،
تللیاں رندہ ، یہ الفاظ جہاں بھی استعمال ہوتے ہیں مفہوم کو بھرپور

سہ[1] جام نو احسان دانش نمبر ص 34

شگفتگی و تازگی دے گئے ہیں - تشبیہات میں بلا کی لطافت اور تراکیب
میں غضب کی ندرت ہے - - - - - آپ نے واقعات کی تاریخیں نہیں
دیں نہ جانے یہ کمی کیسے پوری ہوگی -" [1]

ابراہیم شمیم یوں رقمطراز ہیں -

" جس سر زمین میں آپ نے 34 سال گذر کی اس کا رنگ ، اس کا
زور اور مرد افگن دھوم دھڑکا کہیں نظر نہیں آیا - شستہ اور
دھلی ہوئی زبان لکھنے والے اب کتنے رہ گئے ہیں - آپ کی یادداشت
کی داد دیتا ہوں کہ کوئی دوست ، عقیدت مند ، یا شاگرد یاد سے
محو نہیں ہوا - بشپال کا نام پڑھ کر حیرت ہوئی کہ آپ نے کیسے
یاد رکھا -" [2]

سلطان دستک لکھتے ہیں -

" جہاں تک آپ کے انشاء کا تعلق ہے سو اتنا عرض ہے کہ میں
بھی کونڈے والی گلی اجمیری گیٹ دہلی کا رہنے والا ہوں - لیکن
بہت سے الفاظ اور بہت سا علم مجھے اس کتاب سے ملا - آپ نے
کاندھلے میں بولے جانے والے سادہ ، اور معصوم محاورات اور روز
مرہ لکھ کر نثر کو (سوانحی نثر) ایک نئی کروٹ عطا کی ہے -

---

[1] جام نو - ، احسان دانش نمبر ص 34 - 35

[2] ماہنامہ - جام نو - احسان دانش نمبر ص 36

اور یہ صرف آپ ہی کا حصہ ہے ۔" ؎[1]

احسان دانش پر اشتراکی ہونے کا الزام لگایا جاتا ہے ۔ لیکن جہاں دانش کے مطالعے سے یہ الجھن بھی صاف ہو جاتی ہے کہ وہ شخص جس نے زندگی کو عریاں دیکھا اور اس کی حقیقتوں کو عریاں بیان کردیا ۔ وہ اشتراکی نہیں تھا ۔ احسان دانش وہ شخص ہے جس کو خدا نے صفات دینے میں فیاضی سے کام لیا لیکن وسائل کے معاملے میں قدرت کی فیاضی دکھائی نہیں دیتی ۔ خدا نے انہیں ذہن رسا عطا کیا لیکن ساتھ ہی ساتھ تنگدستی اور معاشی پریشانیوں سے بھی دامن مالا مال کردیا ۔ احسان ایک دردمند اور خرد مند انسان تھے روپے پیسے کی غیر مساوی تقسیم ان کے لئے باعث تکلیف تھی ۔ وہ ایک ہوشمند اور زیرک انسان تھے جو خدا اور اس کی حقیقت سے آشنا تھے ۔ لہذا دنیاوی خداوں کی اکو سے خائف تھے ۔

لکھتے ہیں ۔

خدا کی ذات کا منکر خدا کو پا نہیں سکتا۔ نہ جب تک دل سے داغ ناشناس دور ہوجائے

خدا وہ ہے کہ جس کی عظمت و جبروت کے آگے۔ خود انسان سجدہ کرنے کے لئے مجبور ہوجائے

؎ آجاو گے حالات کی زد پر جو کسی روز

ہو جائے گا معلوم خدا ہے کہ نہیں ہے

زمین نے رنگ بدلا آسمانوں پر شباب آیا

کہ حصے میں خدائی کے خدا کا انتخاب آیا

؎[1] ماہنامہ جام نو احسان دانش نمبر ص 37

وہ اس اشرافیت اور اشتراکی نظام کو ناپسند کرتے تھے جن کے زبان و بیان میں تعصب تھا جن کے قول و فعل میں تضاد تھا - احسان دانش کے نزدیک صحیح اشتراکی متعصب نہیں ہو سکتا تھا - لیکن یہاں ہر اشتراکی متعصب تھا - جس کے ہاں تڑپ اور خلوص کی بجائے محض نعرہ بازی تھی -

احسان نے اپنی زندگی کی ہر سانس کی قیمت اپنی محنت سے ادا کی ہے ان کی زندگی کا سب سے اہم پہلو معاشی اور سماجی ہے - معاشی تنگدستی ان کا ایسا مسئلہ تھا جو ان کو وراثت میں ملا تھا - والدین نے اس تنگدستی کے باوجود ان کی تربیت میں کسی قسم کی کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی ، والدین نے اپنی ہمت سے بڑھ کر تعلیم دلوائی کیونکہ وہ بھی یہ چاہتے تھے کہ ان کا بچہ اچھے برے کی تمیز کر سکے - انہوں نے احسان کو ہر وہ ہنر سکھایا جو وہ سکھا سکتے تھے اور احسان دانش میں بھی یہ وصف موجود تھا کہ والدین نے جہاں بٹھایا وہیں بیٹھ گئے - اور جو ہنر ہاتھ لگا اسے سیکھ لیا ، انسان کی فطرت ہے کہ وہ ناداری ، مفلسی سے گھبرا جاتا ہے اس کی شخصیت اس بار کے تلے دبتی چلی جاتی ہے - اور بحیثیت انسان اس کی شخصیت مسخ ہو کر رہ جاتی ہے - لیکن احسان نے تو تندی باد مخالف سے گھبرانے کی بجائے خود کو اونچا اڑانے کی کامیاب سعی کی اور اپنی شخصیت کو مسخ نہیں ہونے دیا بلکہ زمانے کے لئے عزم و استقلال کی مثال بنا دیا -

احسان کی زندگی ان لاتعداد واقعات کی لڑی ہے جو کسی بھی محنت کش کی کتاب زندگی کھول کر دیکھنے سے نظر آتی ہے - احسان اساسی طور

ہر ایک مزدور تھے انہوں نے جسمانی مزدوری کے ساتھ ساتھ ذہنی مزدوری بھی کی - " جہان دانش " میں جسمانی اور ذہنی مزدوری کے بے شمار واقعات مل جاتے ہیں -

احسان سعی پیہم اور زور بازو کے ساتھ ساتھ خدا پر بھی کامل ایمان رکھتے تھے - وہ اپنی زندگی کے تلخ تجربوں اور واقعات سے افسردہ نہ ہوتے تھے بلکہ انہوں نے اپنے مشاہدے اور تجربے سے وہ سب سیکھ لیا جس نے ان کے ذہن کو آسودگی اور دل کو اطمینان کی دولت سے بھر دیا - انہوں نے زندگی کے تجربے محنت کی عظمت ، علم کی لگن اور ایمان کامل سے اپنی شخصیت میں ان صفات کو پیدا کرلیا جس سے ان کی ہستی معتبر اور عظیم ہوگئی -

ڈاکٹر حسرت کا سگنجوی " احسان اور آئینہ " میں لکھتے ہیں -

" احسان کی زندگی اس امر کا ثبوت ہے کہ وہ ایک با ہمت اور با حوصلہ انسان ہیں - شروع سے ہی حالات کا شکار رہے - کڑی کڑی مصیبتیں جھیلیں ، فاقے کئے ، چلچلاتی دھوپ میں مزدوری کی - مفلسی کی خاطر چوتھی جماعت سے آگے تعلیم حاصل نہیں کی - کبھی روکھی سوکھی کھائی - کبھی یوں ہی سو رہے - صبح ہوتے ہی پھر مزدوری کی تلاش پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لئے مسلسل جد و جہد ، ضروریات زندگی کو جو بے حد محدود تھیں - اس کے باوجود زندہ رہنے کے لئے سخت سے سخت مصیبتیں برداشت کیں اور کبھی حوصلہ نہ ہارا - مایوس نہیں ہوئے ، تخریبی پہلو اختیار نہیں کیا دوسروں کو براہ راست

اپنی غربت کا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا - عین ممکن تھا کہ احسان ایسا کرتے ، اس لئیے کہ تعلیم کی کمی اور زندگی کے کڑوے کسیلے دور احساس محرومی کو بغاوت یا مایوسی و نامرادی کی سمتوں میں لے جاتے۔ لیکن ان کے والد دانش علی انتہائی برد بار انسان تھے ان کی نیکی ، تقوی ، پرہیز گاری اور حق و حلال کی روزی نے ان کی شخصیت پر گہرا اثر ڈالا - اس کے علاوہ اگر کسی نے ان کی شخصیت کو مکمل کیا تو وہ ان کی والدہ ماجدہ تھیں - انہوں نے گو درسی تعلیم حاصل نہیں کی تھی ، لیکن اپنی ذات میں خود ایک ادارہ تھیں - ان کی رگ رگ میں ماننا ہی نہیں اسلام کی اصل روح موجود تھی - صبر و شکر قناعت اور اللہ پر مکمل بھروسا ان کی شخصیت کے جوہر تھے -" سہ[1]

احسان دانش کی والدہ نے احسان کو برے بھلے کی تمیز بتائی اور ہمیشہ رزق حلال کھانے اور کمانے کی تلقین کی - تھوڑے میں گذر اوقات کرلی لیکن حرام لقمہ سے بچنے کی نصیحت ہمیشہ کی - احسان دانش والدہ کی محبت میں سر شار تھے اور والدہ کی نصیحت کو حکم کا درجہ دیتے تھے - اور اسی تربیت کے سبب وہ ساری زندگی قرض کی ندامت سے پاک رہے اور انہوں نے اپنی صداقت کو بھی داغدار نہیں ہونے دیا -

---

سہ[1] ماہنامہ جام نو - احسان دانش نمبر ص 70 - 71

احسان شروع ہی سے ایک محتاط شخص تھے اس احتیاط کے دامن کو انہوں نے کبھی بھی اپنے ہاتھ سے نہ جانے دیا - شمعی کی صحبت ہو یا دوستوں کی محفل انہوں نے نشہ عشق میں بھی خود کو بے قابو نہیں ہونے دیا -

احسان دانش کی زندگی بہت دشوار حالات کا مجموعہ تھی - لیکن قدرت نے انہیں ایک توازن کی صفت ایسی بخشی تھی جس کی بدولت وہ مزدور ہونے کے باوجود لاکھوں انسانوں میں ممتاز نظر آتے ہیں اور علمی وادبی و ادبی دنیا میں بھی وہ شخصیت قد آور نظر آتی ہے - وہ فطری طور پر ایک شاعر تھے اور شاعر حسن سے عام آدمی کی بہ نسبت جلدی متاثر ہوتا ہے - احسان نے زندگی کی تلخ حقیقتوں کے ترش ذائقے کو چکھا لیکن اس کے باوجود انہوں نے اخلاقیات کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیا - وہ حسن سے متاثر ضرور ہوئے لیکن خود کو بے قابو ہونے سے بچائے رکھتے اور اس کے مشاہدے میں گم رہتے - ایک اقتباس دیکھئیے -

" شمعی جب رقص کرتے کرتے تھک کر میرے پہلو میں گر پڑتی تو میرے دل میں زعفران سا مہک جاتا - اور میں ایسا محسوس کرتا کہ میرے سامنے رنگا رنگ پھولوں کے ڈھلوان ہیں جن کے پس منظر میں اونچی نیچی پہاڑیوں کا سلسلہ بادلوں تک چلا گیا - لیکن بحمد اللہ اس عالم ہوش رہا میں کبھی میرا ہاتھ بے ٹھکانے نہیں پڑا اور میں مشاہدے میں گم رہا - " [1]

---

[1] احسان دانش - جہان دانش ص

احسان ایک ایسے شخص تھے جنہوں نے معاشرے میں رہتے ہوئے زندگی بسر کی ۔ اس عرصہ میں ان کے تعلقات جن لوگوں سے استوار ہوتے وہ معاشرے کے ہر موڑ پر دکھائی دیتے ہیں کچھ ان کے بچپن کے ساتھی ، کچھ سکول کے دوست ، کچھ سخت مزدوری کے دنوں کے ساتھی ، کچھ ادبی سنگتوں کے دوست کچھ عزیز رشتہ دار ، محلے دار ان کے ساتھ ساتھ کچھ ایسے لوگ جن کا ان سے کوئی اور رشتہ خونہ تھا لیکن درد کا رشتہ مشترک تھا ۔ انہوں نے ان تعلقات ، واقعات اور سانحات سے زندگی کا تجربہ حاصل کیا ۔ چیزوں کو قریب سے دیکھنے کے عمل نے ان کی قوت مشاہدہ کو صیقل کیا ۔

احسان دانش نے اپنی والدہ کے علاوہ بھی بے شمار عورتوں کو دیکھا ہر ایک عورت نے اپنے تعلق سے ان کے دل پر ایک الگ رنگ اور تاثر چھوڑا ہے ۔ شمعی ایک طوائف تھی لیکن اس نے اپنی محبت اور کردار سے احسان دانش کے دل پر وہ نقش چھوڑا جس کو مٹانا ان کے حالات کے بس میں بھی نہ تھا ۔ لیکن جب احسان حالات سے مجبور ہو کر بازار حسن میں جا بیٹھتے ہیں تو ان کے دل پر اک قیامت سی گذر جاتی ہے ۔ وہ عام جذباتی انسان کی طرح طوائف سے نفرت نہیں کرتے بلکہ وہ ان کی حالت زار پر کڑھتے ہیں اور وہ سوچتے ہیں کہ وہ کونسے حالات تھے جن کی وجہ سے یہ عورتیں جنس بازار بن گئیں ۔ ان حالات کو پیدا کرنے والے کون تھے جن کی وجہ سے یہ عورتیں ماں بہن ، بیٹی ، بیوی جیسے رشتوں میں بند ھنے کی بجائے محض ایک طوائف بن کر رہ گئیں ۔ جن کا رزق ان کے جسم کے بکنے کے ساتھ لازم ہو گیا ہے ۔ احسان دانش ان سوالوں پر سوچتے اور معاشرے کے ان

لوگوں سے نفرت کرتے ہیں جو تاجر ، امیر اور دولت مند ہیں - جنھوں نے اپنے مکروہ اور سفاک چہروں پر نیکی کا لبادہ چڑھا رکھا ہے - اور عورتوں کو گھر کی زینت بنانے کی بجائے بازار میں لے آئے ہیں -

وہ شمعی کی سادگی اور معصومیت سے محبت کرتے ہیں لیکن اس کی نانی کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچتے ہیں تو اس طبقے کی نائکہ کا زندہ خاکہ کھینچ جاتا ہے -

" عمر کے اعتبار سے وہ کبڑی ہو چکی تھی اور سر کے بال کنگھی کھنگی سے اپنی سیاہی کھو چکے تھے مگر اس کی کانی آنکھ زہریلے شعلے کی طرح روشن ہی رہتی ، اس کی چھاتیاں قصاب کی دکان کی میلی صافیوں کی طرح ہو چکی تھیں - اس کے دل میں انسانی عظمت کے دریچے یا تو تھے ہی نہیں یا تیغہ کر دئیے گئے تھے - وہ تمام دنیا کو خود غرض اور ہوس پرست خیال کرتی تھی - نئے امراء کی خوشنودی کے لئے قدیم شرفاء کو نظر انداز کردینا اس کی زندگی بھر کا شیوہ تھا -" [1]

" رفتہ رفتہ شمعی کی نانی کو مجھ سے کچھ دلی بغض سا ہوگیا - اس کے جھریوں سے پٹے ہوئے چہرے پر سکوں کی ہوس اور خد و خال میں فریب کے گوشے بولتے تھے --- اس سے کہہ رہی تھی کہ " آخر

---

[1] احسان دانش - جہاں دانش ص 169 - 170

وہ کلوا چپراسی تیرے پاس کیوں آتا ہے اور تو اسے لے لے کر
علیحدہ کیوں بیٹھتی ہے ؟ آخر تیرا کیا ارادہ ہے بتا تو سہی ؟
سونے کے ڈھیروں پر لات مار آئی اور اب یہاں قصبے میں تین پیسے
کے چپراسی سے پھنس رہی ہے ۔ " [1]

" وہ ناچتے ناچتے پسینے میں شرابور ہو جاتی تو اس کی بلوریں
کے عکس پسینے کی بوندوں میں ستاروں کی طرح ناچنے لگتے وہ ذرا
دم لے کر پھر ناچنے لگتی اس عالم میں وہ ہلکی ہلکی لَے میں ایسا
گاتی جو الفاظ سے بلند صرف آواز کے زیر و بم ہی سے تخلیق ہوتا
تھا اس کے مترنم رقص میں اس کے ہونٹ جنبش سے بیگانہ رہتے ایک
آواز تھی جو اس کے سینے سے اٹھ کر گلے کی شہنائی سے ہوتی ہوئی
نتھنوں میں آ کر نغمہ بنتی تھی ۔ اس وقت وہ نجانے کہاں پہنچ جاتی
کہ اس پر آسیب زدگی کا شک ہونے لگتا ۔۔۔۔ یہ شمعی تک ہی
محدود نہیں جب حسین آنکھوں میں نیند رچتی ہے تو حسن کا جادو
اور بھی سنگین ہو جاتا ہے ۔" [2]

احسان دانش جب شمعی کا ذکر کرتے ہیں تو شمعی کے بلند کردار کا نقشہ کھنچ
جاتا ہے ۔ جس نے دولت کے ڈھیر کو لات مار کر احسان دانش کے اندر چھپے سونے

---

[1] احسان دانش ، جہان دانش ص 170

[2] ایضاً ص 174 ۔ 175

کو پہچان لیا اور احسان دانش کو زندگی کی اس حقیقی لذت سے آشنا کیا جو خال خال لوگوں کو نصیب ہوتی ہے - شمعی احسان دانش کے لئے سراپا محبت تھی جو ان سے صرف اور صرف محبت کی طلب گار تھی - اور خود ان پر اپنی محبت نچھاور کر بیٹھی تھی - اس نے انہیں عشق کی گرمی سے آشنا کیا - وہ دیگر طوائفوں سے یکسر مختلف تھی اس کا عشق بکنے اور جھکنے والا نہیں تھا بلکہ اس میں حیاء کا تقدس بدرجہ اتم موجود نظر آتا ہے - احسان نے طوائف کے گھر اس با حیا لڑکی کو دیکھا تھا - لیکن جب وہ بے روز گاری کے ہاتھوں مجبور ہو کر بازار حسن میں نامہ نویسی کی غرض سے گئے لیکن وہاں بھی ان کی روح کڑھتی رہی - لکھتے ہیں -

" صبح ہوتے ہی مجھے اس بازار میں دوات قلم لے کر بیٹھنا ہوگا جہاں اوباش لوگ بھوکی ننگی عورتوں میں امراض کے لین دین کے لئے آتے ہیں اس تصور نے میرے ذہن پر جالا سا تن دیا اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں کالی آندھی میں گھرا ہوا ہوں اور آنکھوں میں چھوٹی چھوٹی کنکریوں کے ریزے بھر رہے ہیں -" [1]

آگے چل کر کہتے ہیں -

" جب شام کا اندھیرا گہرا ہونے لگتا تو وہ لیپ پوت کر کے اپنے جسموں کو ایک جھوٹی آب و تاب سے سجا لیتیں ، لیکن میری نظروں میں کوئی تو دلے مسلے

---

[1] احسان دانش - جہان دانش ص 229

پھولوں سے لدا مزار تھی اور کوئی بوندوں میں ملفوف اڑتی ہوئی پوڈر - ان گھروں کی روشنی کا ہر قمقمہ عصمتوں کی راکھ میں لتھڑا ہوا لگتا تھا - اندھیرا ہوتے ہی کئی کوٹھوں پر چند ہی چراغ آنکھیں ٹمٹمانے لگتے اور یہ مظلوم و تباہ عورتیں تکیوں سے اترے ہوئے چکٹے غلافوں کی طرح چھجوں پر آ جاتیں اور نگاہوں سے شب شب کے کرایہ طے ہوتا -" [1]

آگے چل کر شمعی کے حوالے سے معاشرہ کو دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں -

" میں اس افلاس میں دھنسی ہوئی مخلوق کو مظلوم سمجھنے پر مجبور ہو جاتا کیوں‌کہ میری نظر میں تو شمعی کا معاشرہ اور اس کے عادات و خصائل تھے وہ اس سطح سے بہت بلند تھی حد سے زیادہ بلند -" [2]

احسان دانش نے اس جنس زدہ زندگی اور اس کاروبار سے دلی نفرت کا اظہار کیا ہے - لیکن وہ وعظ اور نصیحت کے چکر میں نہیں پڑتے - انہوں نے اس بازار میں بیٹھے زندگی کا ایک اور چہرہ قریب سے دیکھا - احسان ایک حساس شخص تھے انہوں نے اس جگہ بیٹھ کر کوئی مالی فائدہ حاصل نہیں کیا بلکہ ذہنی کوفت نے ان کو ایک اور ہی کیفیت سے دوچار کردیا - یہاں بیٹھ کر خط لکھنے کا جو معاوضہ انہیں ملا اس میں سے نہ تو خود کچھ خرچ کر سکے اور نہ ہی وہ کمائی اپنے والدین

---

1. احسان دانش - جہان دانش ص 231
2. ایضاً ص 332

کو بھیجی ۔ شاید دانش اس روپیے کو اس رزق کے ہم پلہ نہیں سمجھتے تھے جس رزق سے احسان نے عمر بھر پیٹ بھرا ۔

" جہان دانش " زبان وبیان کو سب نے سراہا ہے ۔ انہوں نے جہاں بھی کوئی اچھوتا یا کاندھلے کی زمین سے پھوٹتا ہوا لفظ استعمال کیا ۔ قاری کی سہولت کےلئے اس کے معنی اور دیگر معلومات حواشی میں درج کردیئے ۔ اس لئے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے احسان دانش اپنے قاری کا ہاتھ تھام کر اسے اپنے مولا اور مسکن کی سیر کروا رہے ہوں ۔

" جہان دانش " کو پڑھ کر بہت سے نئے الفاظ سے آشنائی ہوجاتی ہے اور اس بات کا احساس بھی ہو جاتا ہے کہ احسان دانش کے پاس الفاظ کا ایک نادر اور وسیع ذخیرہ تھا جسے وہ آسانی اور سلیقہ سے استعمال کرنے پر قادر رہتے ۔

مثلاً الفاظ	معانی	
باولی	زینہ دار کنواں	ص 11
بارابر	شیروانی یا انگوٹھے کا وہ دامن جو نیچے ہوتا ہے اور اس میں بند یا ہک لگایا جاتا ہے ۔	ص 12
شتار دوپہر	بھری دوپہر	ص 18
پہزاوے	بھٹے کی پرانی صورت جسے پجاوا بھی کہتے ہیں ۔	ص 19
تھانگی	کھوجی ۔ سراغ رساں	ص 23

الفاظ	معنی	
کھرنک	خشک	ص 37
تانپا	پیچھا کرنا	ص 38
پچھونڈ مارنا	کپڑے میں بندھا ہوا بوجھ کمر پر ڈالنا	ص 38
آلھا اودل	ایک منظوم جنگی داستان	ص 40
کھوری	جانوروں کے بیٹھنے کی جگہ	ص 42
ڈوک	پانی کا گڑھا	ص 42
پٹھانیے	بھنے ہوئے چنے	ص 51
ولی تنگھر	تجربہ کار اور چو مکھی معلومات رکھنے والا	ص 66

اس کے علاوہ بھی بیسیوں الفاظ کے معانی جگہ جگہ درج کئے ہیں ۔

احسان دانش نے حواشی اور تعلیقات کے ذریعے قارئین کو الفاظ کے معانی ہی نہیں بتائے بلکہ اس عہد کی عظیم شخصیتوں کا تعارف بھی کرایا ہے اور جو بات بھی وضاحت طلب تھی اس کی وضاحت کردی ہے ۔ ارد گرد کا علاقہ ہو یا کوئی خاص رسم اس کی تفصیل انہوں نے ساتھ ساتھ درج کردی ہے ۔

یہ خود نوشت سوانح عمری ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں اور ایام کا احاطہ ہی نہیں کرتی بلکہ ان کے نظریات و عقائد کا خاکہ بھی پیش کرتی ہے ۔ سوشلزم ، مزدور دوستی ، بھروسہ اور یقین محکم ، طلب علم ، عشق ، محنت کی لگن ، انسانیت کا احترام ، خدمت خلق کا جذبہ وغیرہ ۔ غرض ان کی زندگی

کے ہر اہم پہلو کے بارے میں ہمیں مکمل معلومات فراہم کرتی ہے - یہ کتاب اس الزام کی تردید بھی کرتی ہے جس کے تحت ان کو مارکسی کہا جاتا ہے - اس کی بین دلیل ان کی خدا پرستی اور انسان دوستی ہے - وہ تو برملا سوشلزم کمیونزم اور مارکسزم سے اپنی بیزاری اور نفرت کا اظہار کرتے تھے اور اسلامی تعلیم کی روشنی میں اپنے عقائد اور خیالات کا اظہار کرتے تھے - وہ معاشرت کے ان ناسوروں سے نفرت کا اظہار کرتے ہیں جن کے سبب معاشرہ اخلاقی سرطان کا شکار ہے وہ نہ صرف ان وجوہ سے نفرت کرتے ہیں بلکہ ان کی نشاندہی بھی کرتے ہیں - انہوں نے اپنی زندگی کے نشیب و فراز کو واقعات و محرکات کے ذریعہ زیادہ پرتاثیر بناکر پیش کیا ہے - انہوں نے واقعات کو بیان کرتے وقت خارجی مناظر کے ساتھ ساتھ اپنے احساسات و تاثرات کو اس طرح بیان کیا ہے کہ قاری خود اس میں کھو کر رہ جاتا ہے -

وہ ایک حساس شخص تھے اس لئے انہوں نے اپنے گرد و پیش کے حالات و واقعات پر اس انداز سے نظر ڈالی ہے کہ ہمیں اس خود نوشت آپ بیتی میں ان کے عہد کی جھلک دکھائی دیتی ہے اور وہیں پر شہری زندگی کا فرق بھی کھل کر ہمارے سامنے آتا ہے -

14 ، اگست کے حوالے سے پاکستان کے وجود میں آنے کا مختصر حال بھی اس کتاب کا اہم حصہ ہے - اس میں انہوں نے قیام پاکستان کے لئے دی جانے والی قربانیوں کو بیان کیا ہے اور دوسری طرف قیام پاکستان کے بعد امراء کی بے حسی

کو بیان کیا ہے کہ ان لوگوں نے کتنی جلدی اپنے ساتھیوں کی قربانیوں اور اس نظریے کو فراموش کردیا جس کی بنا پر یہ ملک خداداد وجود میں آئی ۔ اس آپ بیتی کو پڑھ کر یہ احساس بڑھ جاتا ہے کہ احسان دانش کا اسلوب ان کا حافظہ ، ان کی قوت تخلیق ، اس کتاب کی اہم خوبیاں ہیں ۔ انہوں نے اپنی زندگی کے اہم واقعات کو اس میں جگہ دی ہے اور اپنی کتاب زندگی کو طوالت کی خامی سے پاک رکھنے کی شعوری کوشش کی ہے ۔

انہوں نے تاثراتی تصویر کشی کرتے ہوئے جذبات نگاری کا خاص خیال رکھا ۔ قدرتی حسن کی تعریف ہو یا کسی مشاعرے کا حال وہ ہر منظر کی لفظی تصویر کشی ماہر مصور کی طرح کھینچ کر رکھ دیتے ہیں ۔ انہوں نے اس آپ بیتی میں 1948ء تک کے حالات قلمبند کئے ہیں ۔ یہ آپ بیتی انسانی محنت اور دیانت فکر و عمل کے روشن نقوش منظر عام پر لاتی ہے ۔ اور بہت سی اہم شخصیات مثلاً شورش کاشمیری ، م حسن لطیفی ، مولانا تاجور نجیب آبادی ، علامہ اقبال حکیم نیر واسطی وغیرہ کا ذکر بطور خاص کیا گیا ہے ۔

مختصر یہ کہ " جہان دانش " میں احسان دانش نے زندگی کے تلخ و شیریں حقائق کو ایسے اسلوب اور زبان و بیان کے ساتھ بیان کیا ہے کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ زبان کا بہاو ، سلاست اور روانی قدم قدم پر اپنے حسن کے جھنڈے گاڑ رہی ہے۔ اور اس کی زبان کی دلکشی و دلآویزی اور دلچسپی قاری کو بار بار یہ دعوت دیتی نظر آتی ہے ۔

ع کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست ۔

باب ششم

معاصر آپ بیتیوں میں "جہان دانش" کا مقام

باب ششم

معاصر آپ بیتیوں میں "جہان دانش" کا مقام

خود نوشت سوانح عمری کسی شخص کی وہ داستان حیات ہے جس کے کردار، ماحول، حالات و واقعات اس کے اپنے ہوتے ہیں لیکن یہ سب کچھ اپنا ہونے کے باوجود اس کی زندگی کی ڈور قدرت کے ہاتھ میں ہوتی ہے - خدا سب سے بڑا مصور سب سے بڑا صناع اور سب سے بڑا مصنف ہے - لیکن جہاں ہم خدا کی دیگر حیثیتوں کو دیکھتے ہوئے اس کی بڑائی کا اعلان و اقرار کرتے ہیں وہاں ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ خدا سب سے بڑا مصنف ہے - وہ انسان کو پیدا کرتا ہے اور اس کی زندگی کے واقعات کو اس طرح ترتیب دے دیتا ہے کہ انسان کردار کی مانند اپنا رول ادا کرتا چلا جاتا ہے - خود نوشت سوانح عمری میں وہ اپنی زندگی کے سبھی واقعات حالات کو بیان کرتا چلا جاتا ہے کہ اس نے کس گھر میں آنکھ کھولی اردگرد کا ماحول کیسا تھا - اس کا بچپن لڑکپن جوانی بڑھاپا کن ساتھیوں کے ساتھ گزرا - اس کی تعلیم کیسے مکمل ہوئی - زندگی نے اس کے دامن میں کتنی خوشیاں ڈالیں - کتنے دکھ اس راہگزار میں اس کے دامن سے لپٹے ، اس نے کس طرح کے ماحول میں پرورش پائی - اس کا عہد کیسا تھا - وغیرہ وغیرہ گو وہ سوانح عمری لکھتے وقت اپنے ماضی کی طرف پلٹ کر دیکھتا ہے - لیکن اس کے ساتھ ساتھ حال کے مستقبل کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے پڑھنے والوں کے لیے کبھی بین السطور اور کبھی اعلانیہ ایسا پیغام دے جاتا ہے

جو ان کی زندگی کو الجھنے سے محفوظ رکھ سکے ۔

اپنی آپ بیتی لکھنا آسان کام نہیں ۔ دوسروں پر تنقید کرنا بے حد آسان ہے ۔ لیکن خود اپنا نقاد بننا اور خود اپنا احتساب کرنا ہر کسی کے بس کا کام نہیں ۔ اس کے لیے عالی ظرف اور عالی حوصلہ ہونا ضروری ہے ۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ بیتی میں ایسی دلچسپی ہونی چاہیے کہ لکھنے والا دلجمعی سے اپنی داستان حیات کو صفحات پر منتقل کرے اور پڑھنے والا اسے دلچسپی سے پڑھے ۔ اس میں داخلی اور خارجی حوالے سے اس قدر جان ہونی چاہیے کہ قاری اسے افسانہ سمجھ کر نہ پڑھے بلکہ اس کے حقائق کو اس طور پر سمجھے کہ اس سے اپنے لیے اخذ کر سکے ۔ آپ بیتی لکھنے والے کی شخصیت میں وہ سحر ہونا چاہیے کہ قاری اس کی باتوں کو غیر اہم نہ سمجھے بلکہ اس کی اہمیت پر کان دھرے ۔ آپ بیتی اس قدر واضح ہونی چاہیے کہ اس میں کسی قسم کا ابہام نہ ہو اور اس کا اثر بھی زور دار ہو ۔ دو یا دو سے زیادہ اشخاص، اشیاء اور فن پاروں میں تقابل کی ضرورت اس وقت محسوس ہوتی ہے جب ان میں ایک یا ایک سے زیادہ سطحوں پر اشتراک پایا جائے ۔ کیونکہ جب تک ان میں وجہ اشتراک واضح نہ ہو تب تک تقابل کا جواز پیدا نہیں ہوتا ۔ جن اشیاء کے درمیان تقابل کیا جانا مقصود ہوتا ہے ان میں وہ اشتراک کے ساتھ ساتھ وجہ اختلاف بھی اہمیت کی حامل ہوتی ہے ۔ کیونکہ جب ہم ان چیزوں کے مشترکہ پہلوؤں کی نشاندہی کرتے ہیں تو ساتھ ہی ساتھ ان عناصر کو بھی سامنے لاتے ہیں جو انہیں ایک دوسرے سے

منفرد اور مختلف ٹھہراتے ہیں ۔

جہاں دانش کے ساتھ ساتھ " یادوں کی برات " " مٹی کا دیا " دو مختلف آپ بیتیاں ہمارے پیش نظر ہیں ۔ چونکہ تینوں آپ بیتیاں اور ان کا تعلق ان اشخاص سے ہے جو اردو ادب میں نمایاں مقام رکھتے ہیں ۔ اور ان کی اپنی انفرادی حیثیت ہے ان کا اپنا منفرد اسلوب ہے ۔ ان کی اپنی الگ داستان حیات ہے ۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی اہم ہے کہ ادب خلاء میں تخلیق نہیں ہوتا ۔ اس کی تخلیق میں بہت سے سیاسی معاشرتی اور دیگر عوامل اپنا کردار ادا کرتے ہیں ۔ یہ ہی وجہ ہے کہ ادب کا مطالعہ کرتے وقت ہمیں بہت سی باتوں کو مد نظر رکھنا پڑتا ہے ۔ مثلاً زمانی پس منظر ، سیاسی حالات اس مخصوص عہد کی زبان و بیان ، رسوم و رواج وغیرہ وغیرہ ۔

خود نوشت سوانح عمری کی حیثیت روزانہ لکھی جانے والی ڈائری کی سی نہیں ہے ۔ جس میں واقعات کو دنوں ، مہینوں اور سالوں کی ترتیب سے درج کردیا جائے بلکہ اس میں لکھنے والا خارجی زندگی کی تار پور بننے کے ساتھ ساتھ اپنی ذات کے اندر کے سفر کو بھی پیش کرتا ہے ۔ وہ ان باتوں کو سامنے لاتا ہے جن سے بعض اوقات دوسرے واقف نہیں ہوتے ۔ وہ اپنی ذات کے اوپر چڑھے ہوئے خول کو توڑتا ہے اور اس اصل کے بارے میں لکھتا ہے جس کو اسکے علاوہ کوئی اور نہیں جانتا ۔ گو بعض اوقات کچھ ایسے واقعات وہ رقم نہیں کرتا جن کو چھپانے میں کوئی مصلحت ہو ۔ اور اکثر

اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کی وہ حقیقتیں سامنے لے آتا ہے جس سے معاشرے میں اس کا بنا بنایا مقام چھن جانے کا خدشہ ہوتا ہے چونکہ آپ بیتی میں مصنف اپنی ذات کے سفر کو بیان کرتا ہے اس لیے ہمیں اس میں اس کے مخصوص عہد کی جھلک ، معاشرت، تہذیب، سیاست ، ثقافت ، رسم و رواج ، نظر آتا ہے ۔

انسان کی ذات خود ایک انجمن ہوتی ہے جس میں اس کی روح ، ذات ، احساسات و جذبات ، کے جلوے بکھرے ہوئے ہوتے ہیں اور مصنف اپنی ذات میں ڈوب کر ان سب چیزوں کو الفاظ کے پیکر میں ڈھال کر ان کی لفظی تصویریں اس طرح سے پیش کرتا ہے کہ ہر منظر اپنی تمامتر رعنائیوں کے ساتھ کاغذ پر ظاہر و باہر ہو جاتا ہے ۔ گو خود نوشت سوانح عمری سچ کی متقاضی ہوتی ہے ۔ لیکن قارئین کو بھی کسی خود نوشت کا مطالعہ کرنے سے پہلے ایک بات ذہن میں رکھ کر مصنف کو تھوڑی سی گنجائش دینی پڑتی ہے کہ وہ ایک انسان کی تحریر پڑھ رہے ہیں جس میں اس کی بشری جبلت بہت کچھ چھپانے اور بہت کچھ بتانے کی اجازت دیتی ہے ۔ اس بات کو ذہن میں رکھنے سے مطالعہ کا مزا دوبالا ہو جاتا ہے ۔

اب اس بحث کو سمیٹتے ہوئے معاصر آپ بیتیوں میں "جہان دانش" کے مقام کا تعین ضروری معلوم ہوتا ہے ۔ گو معاصر آپ بیتیوں کے ذیل میں بہت سی آپ بیتیاں آتی ہیں لیکن راقم نے جو آپ بیتیاں منتخب کی ہیں ان میں مرزا ادیب کی آپ بیتی "مٹی کا دیا" اور جوش ملیح آبادی کی آپ بیتی

"یادوں کی برات" ہیں۔ ہم سب سے پہلے میرزا ادیب کی آپ بیتی "مٹی کا دیا" کا جائزہ لینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

"مٹی کا دیا" کا تنقیدی جائزہ۔

میرزا ادیب جن کا اصل نام دلاور علی ہے اردو ادب کے ایک ایسے نامور ادیب ہیں جن کی تخلیقات کا جائزہ لیں تو ان کی صلاحیتیں کھل کر سامنے آتی ہیں۔ اس باب میں "مٹی کا دیا" پر گفتگو کے آغاز سے پہلے ہم میرزا ادیب کی تخلیقات (نظم و نثر) کی فہرست پر نگاہ دوڑاتے ہیں۔

ان کی تصانیف کچھ اسی طرح ہیں۔

رومانوی افسانے

1۔ صحرا نورد کے خطوط۔

2۔ صحرا نورد کے رومان۔

3۔ صحرا نورد کا نیا خط۔

مختصر افسانے

1۔ لاوا

2۔ جنگل

3۔ کھیل

ڈرامے

1۔ آنسو اور ستارے۔

2 - لہو اور قالین

3 - ستون

4 - فصیل شب

5 - ماموں جان اور ماموں جان

6 - پس پردہ (آدم جی انعام یافتہ)

7 - خاک نشین

8 - شیشہ و سنگ

9 - شیشے کی دیوار -

تنقید -

1 - مطالعہ اقبال کے چند پہلو -

خاکہ نگاری -

1 - ناخن کا قرض

تراجم -

1 - جدید افسانے (امریکی افسانہ نگاروں کے چھ افسانوں کا مجموعہ)

2 - پراسرار وادی (امریکی افسانہ نگاروں کے گیارہ افسانوں کا مجموعہ)

3 - افق کے پار (یوجین اونیل کے ڈراما The Horizon کا ترجمہ)

4 - واشنگٹن ارونگ (لوینس لیری کی کتاب کا ترجمہ)

تالیفات :

1۔ بہترین ادب 48ء سے لے کر 55ء تک

2۔ تنقیدی مقالات (دو جلدیں)

3۔ انمول کتابیں ۔ اردو کے کلاسیکی ادب کا انتخاب

4۔ عود ہندی غالب کے مکاتیب

5۔ رستم و سہراب آغا حشر کا ڈراما

بچوں کے لیے ناول :

1۔ چچا چونچ یونائٹڈ بینگ انعام یافتہ ۔

2۔ شہر سے دور

3۔ گڑیوں کا شہر

ڈرامے :

1۔ پانچ ڈرامے یونائٹڈ بینک انعام یافتہ

2۔ وہ ڈاکٹر نہیں تھا ۔

3۔ اے وطن ، میرے وطن

4۔ قوم کی بیٹی

5۔ تیس مار خاں

6۔ ڈالیاں

7۔ انسپکٹر صاحب آئے

8 - سات کھیل

9 - نانی اماں کی عینک (یونائیٹڈ بینک انعام یافتہ)

10 - بگی کی گڑیا

11 - بچوں کے ڈرامے

12 - ماں کا خواب (علامہ اقبال کی نظموں پر مبنی کھیل)

سوانح حیات =

1 - جمال الدین افغانی

2 - حضرت داتا گنج بخش

3 - امیر خسرو

کہانیوں کے مجموعے =

1 - ایک آدمی

2 - شیروں کا بادشاہ

3 - باپ کی خدمت

4 - چالاک ہرن

5 - باپ کی خدمت

خود نوشت سوانح عمری =

" مٹی کا دیا "

اس کے علاوہ بھی ان کی چند اور تخلیقات ہیں جن میں متاع دل "

کا شمار بھی ہوتا ہے ۔ " مٹی کا دیا " ان کی خود نوشت سوانح عمری ہے۔ انہوں نے اس کٹھن کام کو بہت خوبی سے مکمل کیا ہے۔ ماضی کے واقعات کو ایک بڑے عرصے کے بعد دہرانا بہت مشکل عمل ہے ۔کیونکہ اپنی تمام تر ذہانت کے باوجود طویل عرصے کے بعد چیزوں اور واقعات کو دہرانے سے ان کی معروضیت پر اثر ضرور پڑتا ہے ۔ اور وقت کے اس دائرے میں سفر کرتے کرتے انسان کی شخصیت اور حافظے میں بھی کچھ تبدیلیاں چپکے چپکے آ جاتی ہیں ۔ اور اہم اور غیر اہم واقعات کی ترجیحی حیثیت تبدیل ہو چکتی ہے۔

میرزا ادیب نے بچپن کی خوشگوار یادوں اور جوانی کی بہاروں کو اس خوبی سے بیان کیا ہے کہ پڑھنے والا ان سطور کو عبارت کی طرح سے نہیں پڑھ سکتا بلکہ اس تحریر میں اپنے جذبوں کے ساتھ شامل ہو جاتا ہے ۔

میرزا ادیب کی پہلی تصنیف " صحرا نورد کے خطوط" اردو ادب کی ایک ایسی رومانی تخلیق ہے جو نہ صرف ان کی وجہ شہرت بنی بلکہ آج بھی اسی ذوق و شوق سے پڑھی جاتی ہے ۔ اس کتاب کو اردو کے جدید کلاسیکی ادب کی ذیل میں رکھا جا سکتا ہے ۔ طلسماتی فضا ، رومانوی اسلوب ، خوبصورت فضا " حب الوطنی " آہستہ آہستہ سلگتا ہوا رومان ان کی تحریر کے اہم عناصر ہیں ان کا فکری ، تخلیقی سفر گزشتہ نصف صدی کے عرصے پر محیط ہے ۔

انہوں نے پچاس کے قریب کتابیں لکھیں اور اس زندگی کے سفر کو انہوں نے " مٹی کا دیا " میں تحریر کر دیا ۔

" مٹی کا دیا " کا پہلا ایڈیشن جولائی 1981 میں لاہور سے شائع ہوا۔

دوسرا ایڈیشن 1984ء میں چھپا - تیسرا ایڈیشن 1992ء میں منظر عام پر آیا -

اس خود نوشت سوانح حیات کے کل 62 ابواب ہیں - باسٹھواں باب ان کی تصانیف پر مشتمل ہے جن کی تفصیل پہلے آ چکی ہے - یہ خود نوشت سوانح عمری 727 صفحات پر مشتمل ہے - میرزا ادیب نے اسے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے - باب اول سے لے کر باب 34 چونتیس تک انہوں نے اپنی زندگی کے ادوار یعنی بچپن جوانی اور بڑھاپے کو باالترتیب سپرد قلم کیا ہے- دوسرا حصہ اٹھائیس 28 - ابواب پر مشتمل ہے جس میں انہوں نے سترہ ابواب میں " میرے ہمدم میرے دوست " کے عنوان سے اپنے احباب کا ذکر کیا ہے - جن کی تفصیل اس طرح سے ہے -

غلام عباس ، عصمت چغتائی ، کرشن چندر ، احمد ندیم قاسمی ، راجندر سنگھ بیدی ، کنہیا لال کپور ، خدیجہ مستور ، ڈاکٹر وحید قریشی ، مشفق خواجہ ، آغا شورش کاشمیری ، محمد عبداللہ قریشی ، مرزا محمد منور ، ڈاکٹر جمیل جالبی ، ڈاکٹر سلیم اختر ، حفیظ تائب ، شفیق الرحمن ، لطیف کاشمیری ، میرزا ادیب نے اپنے احباب کے تذکرے کے بعد " میرے مکرم میرے دوست " کے نام سے ایک باب ترتیب دیا ہے اور یوں بے تکلف دوستوں اور احباب کے بعد ان دوستوں کا ذکر کیا ہے جن سے انہیں عقیدت ہے- ان کی تعداد چھ ہے جسکی ترتیب یوں ہے ؛

علامہ اقبال ، مولانا ابوالکلام آزاد ، حافظ محمود شیرانی ، آغا حشر کاشمیری

ڈاکٹر سید عبداللہ اور عبدالرحمن چغتائی ۔ ساٹھویں باب میں انہوں نے اپنے بمبئی کے شب و روز کو قلمبند کیا ہے اور تصانیف کے تذکرے سے پہلے اپنے ایک گمنام محسن، کا ذکر کیا ہے اور خود نوشت سوانح عمری کا اختتام "اختتامیہ" کے عنوان سے ایک نظم کی صورت میں کیا ہے لکھتے ہیں ۔

اختتامیہ

" مسافر ! تو کہاں سے آیا ہے ؟

ماضی کے اندھیرے غاروں سے

اندھیر تو آج بھی ہیں

میرے ہاتھ میں مٹی کا دیا ہے ـــــ روشنی میرے ساتھ چلتی رہی

تیری منزل کہاں ہے ؟

وہ ـــ دور نور افشاں افق ایک روز میں اپنی یہ ننھی سی

لو اسکی بے کراں روشنیوں میں شامل کر دوں گا اور خود چپ چاپ

وادی خاموشاں میں اتر جاؤں گا ۔

" مٹی کا دیا " میں میرزا ادیب نے " میرزا ادیب " کی خود نوشت سوانح عمری لکھنے سے پہلے اس کی پہلی حیثیت اور شخصیت کی کھوج لگائی ہے اور ماضی کے دھندلکوں میں چھپے ہوئے دلاور علی کی سرگزشت بیان کر دی ہے ۔ جو کل کا دلاور علی اور آج کا میرزا ادیب ہے ۔ جس کی ماں اسے ہمیشہ " دلور " کے نام سے پکارتی تھی ۔ میرزا ادیب لکھتے ہیں ۔

" میری روداد پڑھنے والے ان صفحات میں اس شخص کو ڈھونڈنے کی کوشش کریں گے ۔جو اپنے آپ کو " مٹی کا دیا " کہتا ہے ۔عرض کر دوں کہ میں بھی اس شخص کا تعاقب کرتا رہا ہوں اور اب تک کر رہا ہوں کبھی کبھی تو محسوس ہوتا ہے کہ میں ایک پرچھائیں کے پیچھے بھاگتے بھاگتے تھک گیا ہوں اور کبھی یوں بھی لگا ہے کہ میں نے اسے پا لیا ہے ۔ اور یہ میری اپنی گرفت میں ہے ـــ مگر یہ کیفیت عارضی ثابت ہوتی ہے کہ گوشت پوست کا بنا ہوا یہ انسان دیکھتے ہی دیکھتے ایک سائے میں تحلیل ہو گیا ہے ۔ یہ میری شخصی کمزوریوں کا نتیجہ ہے کہ انسان اس فن میں فطرتاً بڑا ماہر ہے کہ جب چاہتا ہے اپنی نظروں سے چھپ جاتا ہے ۔وہ خوب جانتا ہے کہ یہ نظریں اس کی گہرائیوں تک اتر سکتی ہیں بہر حال میں نے تعاقب جاری رکھا ہے ۔اس تعاقب میں کئی منازل کئی مراحل سے گزرا ہوں اور اس کوشش کا حاصل کچھ ایسے نقوش ضرور فراہم ہو گئے ہیں جن کے اندر چھپی ہوئی حقیقتوں کو باہر نکال لانا میرے ان پڑھنے والوں کا کام ہے ۔جو دیدہ ور بھی ہیں اور انسانی فطرت کے بھی اور ان دونوں چیزوں سے زیادہ یہ کہ انسان کے متعلق ان کا نظریہ ہمدردانہ ہے ۔ [1]

اس طویل اقتباس کو درج کرنے کا مقصد یہ تھا کہ میرزا ادیب کو آغاز میں ہی

---

[1] میرزا ادیب " مٹی کا دیا " لاہور۔مقبول اکیڈمی 1992ء ص 7 تا 8

یہ احساس ہو گیا تھا کہ انہیں تو اپنی سوانح حیات لکھتے وقت ماضی کے اندر جھانک کر دیکھنا پڑے گا لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ اس بات کا بھی احساس اس شدت سے رکھتے ہیں کہ وہ لوگ جو اس خود نوشت کو پڑھیں گے وہ بھی اس شخص کو تلاش کرنے کی جستجو کریں گے جو خود کو مٹی کا دیا کہتا ہے - اور صرف میری بات پر ہی مکمل اعتماد نہیں کر بیٹھیں گے بلکہ وہ ان نقوش کو کھوجتے ہوئے حقیقتوں تک رسائی حاصل کریں گے اور حقیقت کو منظر عام پر بھی لائیں گے - لیکن اس تلاش و جستجو میں وہ اس بات کا ادراک شعوری طور پر رکھیں گے کہ وہ ایک انسان کی خود نوشت پڑھ رہے ہیں - جس کی لغزشیں جذبات ، احساسات ، حالات ، واقعات ، سوچ اور خیالات دوسرے گوشت پوست کے انسانوں کی طرح ہیں وہ ان سے ماورا نہیں ہے -

جمیل احمد عدیل لکھتے ہیں "

"بہت کم آپ بیتیاں تخلیق کے اس درجہ پر پہنچتی ہیں جنہیں قلبی اضطراب کا ثمر شیریں قرار دیا جا سکے کہ ان میں سے اکثر مصنفین کے علم و مطالعہ کا نتیجہ ہیں ، نہاں باطن کا پھل نہیں ، مگر میرزا ادیب نے اپنے باطن کے سمندر میں غوطہ لگایا اور نصف صدی تک اس میں موجود رہے - بس آکسیجن کے حصول کے لیے باہر کی دنیا سے رابطے کی صورت باقی رہنے دی اور جب بھی وہ باہر آئے تو اپنی تخلیقات کے چند دریائے خوش آب ساحل سمندر کی ریگ پر

چھوڑ گئے جو اس بات کا ثبوت تھے کہ میں اپنی ذات کے قاموس میں
زندہ ہوں ، تلاش کا عمل جاری ہے۔"[1]

میرزا ادیب کی خود نوشت کے کچھ حصے مختلف رسائل و جرائد میں بھی چھپ چکے ہیں۔ جن میں سے سیارہ ڈائجسٹ ، اردو ڈائجسٹ اور قومی ڈائجسٹ "اور ماہ نو اہم ہیں۔ ان رسائل میں ان کی خود نوشت کو پذیرائی ملی اور شاید کسی حد تک اس پذیرائی کے نتیجہ میں یہ مکمل خود نوشت سوانح حیات وجود میں آئی۔

" مٹی کا دیا " پر ایک اعتراض یہ کیا جا سکتا ہے کہ اس میں واقعات کی ترتیب سن کے حساب سے نہیں ملتی۔ میرزا ادیب کو اس اعتراض کا ادراک پہلے سے ہو چکا تھا اس لیے انہوں نے " پیش لفظ " میں ہی اس متوقع اعتراض کا جواب درج کر دیا ہے۔ لکھتے ہیں

"یہاں اس حقیقت کا اظہار بھی کرتا چلوں کہ میں نے آپ بیتی لکھی ہے تاریخ ہرگز نہیں ، جو کچھ لکھا ہے اس میں تاریخ اور جغرافیے کے معینہ اصولوں کی پابندی نہیں کی۔ اور کر بھی نہیں سکتا تھا میں نے اپنی زندگی کے بیتے ہوئے واقعات کو انہی اصولوں میں دیکھا ہے جس طرح وہ میری یادداشتوں کی دنیا میں اپنا پرتو ڈال

---

[1] جمیل احمد عدیل ، سیاق و سباق۔ لاہور عمیر پبلشرز۔ بار اول مئی 1995ء ص 68

رہے ہیں - وہ سب کچھ جو کبھی تھا - تاریخ اور جغرافیے کی حقیقتوں کے اندر میری داخلی دنیا میں آ کر ــــ اور سالہا سال تک کہیں رہ کر میری ذات کا حصہ بن چکا ہے اور ذات جب کسی شے کو اپنا حصہ بنا لیتی ہے تو اسے اس انداز سے قبول نہیں کرتی جس طرح تاریخ اور جغرافیہ اسے قبول کرتا ہے - کیونکہ ذات کا اپنا پر اسرار عمل ہمیشہ جاری رہتا ہے - جو اس شے میں تغیر و تبدل لاتا رہتا ہے - میرے اندر جو شکست و ریخت ہوتی رہی ہے ، ہوتی رہتی ہے اس کا اثر ہر اس چیز پر پڑتا ہے جو میرے اندر ہے اور میں خود بھی اس سے واقف نہیں ہوں -" سلہ[1]

ڈاکٹر بشیر سیفی لکھتے ہیں "

"میں اسے اس لحاظ سے ایک منفرد خود نوشت کہوں گا کہ مصنف نے اسے زمانی ترتیب اور ســنین کی میکانکیت سے بچا کر ایسی تخلیق بنا دیا ہے جسے افسانے کی سی دلچسپی سے پڑھا جا سکتا ہے -" ســہ[2]

یہ حقیقت ہے کہ آپ بیتی پڑھتے وقت قاری یہ بھی جانتا ہے کہ وہ سینن و تواریخ سے بھی آگاہ ہو جائے لیکن اس کے لاشعور میں یہ بات بھی موجود ہوتی ہے کہ وہ کوئی تاریخ کی کتاب نہیں پڑھ رہا - جس میں سینن و تواریخ کا التزام ضرور کیا گیا ہو - لیکن کوئی تاریخی واقعہ درج کرتے وقت سینن ، تواریخ

ســہ[1] میرزا ادیب - " مٹی کا دیا " لاہور - مقبول اکیڈمی - بار اول 1992ء ص 8

ســہ[2] بشیر سیفی - ڈاکٹر - " تنقیدی مطالعے " - لاہور - نذیر سنز پبلشرز 1996ء ص 9

کی موجودگی کا التزام کرنا مصنف کا بنیادی فرض ہوتا ہے ۔ میرزا ادیب نے اس بنیادی فرض کو نبھانے کا اہتمام بھی کیا ہے ۔ مثلاً اپنی تاریخ پیدائش کا ہی ذکر نہیں کیا بلکہ اس " پرلے اندر " کا ذکر بھی کیا ہے جس میں انہوں نے اپنی زندگی کا پہلا سانس لیا تھا ۔ ممتاز انشا پرداز مولانا صلاح الدین کے مکان کا ذکر بھی کیا جسے 1947ء کے ہنگامہ میں جلا کر کھنڈر بنا دیا گیا تھا ۔ اور مولانا کا نہایت قیمتی زخیرہ ادب جل کر خاکستر ہوگیا تھا ۔ آپ نے 1935ء میں اپنی تعلیم کا آخری سال مکمل کرنے کا ذکر بھی کیا ہے ۔ اسکے علاوہ دسمبر 1935ء میں "ادب لطف " کی ادارتی ذمے داریاں سنبھالنے کا بیان کیا ہے ۔ اور 1941ء کے وسط میں "ادب لطیف " سے الگ ہو کر بیکار ہونے کا ذکر کیا ہے ۔ پھر ہفت روزہ مصور ، بمبئی کی ادارت کا ذکر ہے ۔ 1936ء میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا ۔ پھر 7 دسمبر 1981ء کی شام کو وزیر دفاع میر علی احمد تالپور کی زیر صدارت " مٹی کا دیا " کی تقریب رونمائی کا ذکر کیا ہے۔

میرزا ادیب نے اپنی خود نوشت سوانح عمری کو پرانے خطوط پر استوار نہیں کیا بلکہ چند سنین و تواریخ کا التزام کر کے اس آپ بیتی کو خارجیت اور اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنی داستان حیات کو معروضیت پر مبنی منطق کتاب بھی نہیں بننے دیا ۔ ایر پیچ تحریر سے بھم بھی نہیں ہونے دیا ۔ انہوں نے معروضیت اور داخلیت کے امتزاج سے ایک خاص تاثر پیدا کیا ہے ۔ جو یقیناً پڑھنے والے کے باطن کو مصنف کے باطن سے آگاہ کرنے کے لیے راہ کو ہموار کر دیتا ہے ۔

میرزا ادیب نے اپنی خود نوشت میں سینن و تواریخ کا التزام کیا ضرور ہے لیکن بہت کثرت سے نہیں بلکہ انہوں نے سینن و تواریخ کی بہ نسبت واقعات اور شخصیات پہ توجہ دی ہے جس سے اس خود نوشت میں دلچسپی کا عنصر برقرار رہا ہے - لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ قارئین کی یہ خواہش بھی ہو سکتی ہے کہ وہ جان سکیں کہ میرزا ادیب کی تاریخ پیدائش ان کے تعلیمی مدارج ، ملازمتوں کے سینن کیا ہیں ؟ نیز ان کی کتابوں کے سن اشاعت کیا ہیں ؟ زندگی کے کونسے عہد نے انہیں یہ کتابیں تخلیق کرنے کی تحریک دی ، ان کی شادی کس سن میں ہوئی - بچوں کے سن پیدائش کیا ہیں ؟ یا اگر وہ کوئی سیاسی واقعہ تحریر کر رہے ہیں تو اس کا سن کونسا ہے - وغیرہ وغیرہ ، لیکن ان تفصیلات کو درج کرنے کی بجائے انہوں نے اپنی یادداشت میں محفوظ واقعات کو اس ترتیب سے پرویا ہے کہ ان کی ایک لڑی بن گئی ہے - اسطرح یہ خود نوشت سوانح عمری سینن تواریخ سے مزین خود نوشت سوانح عمریوں میں منفرد مقام کی حق دار ٹھہرتی ہے -

میرزا ادیب کا شمار ان ادیبوں میں ہوتا ہے جن کے تخیل کی پرواز بہت بلند ہے صحرا نورد کے خطوط " " صحرا نورد کے رومان " دونوں کی فضا ان کے تخیل کی کرشمہ سازی ہے - وہ چاہتے تو اپنی داستان حیات کو کسی اور کی " کہانی " بنا کر بہت سے رنگوں سے سجا کر اور دلکش بنا سکتے تھے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ انہوں نے اصل پھولوں کا

خوش رنگ خوشبودار گلدستہ بنایا ہے ۔ جس میں " دلاور علی " کی سرگزشت لکھ ڈالی ہے ۔ لیکن فضا ایسی حقیقی ہے کہ یہ خودنوست پڑھنے والے خود میرزا ادیب کے ساتھ مل کر " دلاور علی " کی کھوج میں نکل کھڑے ہوتے ہیں اور ہر مقام پر جیسے ہی میرزا ادیب کسی کا کوئی نقش پاتے ہیں تو قاری کو بھی اس سے آگاہ کرتے ہیں تاکہ وہ ان نقوش کے ذریعے اس تک پہنچ سکے ۔

میرزا ادیب اپنی خود نوشت سوانح عمری کے پہلے حصے میں اپنے بچپن ، بچپن کے ماحول ، اپنے والد صاحب اور تایا کی شخصیات کے ساتھ ساتھ اپنی ماں اور دادی اماں کی شخصیت سے بھی متارف کروایا ہے ۔ جنہوں نے ان کی شخصیت پر اپنے گہرے نقوش چھوڑے ہیں ۔ شہر لاہور کے "بھاٹی گیٹ" کے "محلہ ستھان" اور اس کے مرکزی علاقے " چوک دیوی وتا " کے پہلو سے نکلنے والی چھوٹی "گلی مغلاں" کا ذکر کیا ہے جہاں ان کے دادا " میرزا غلام حسین " نے دو مکان خرید رکھے تھے اور اسی میں ایک دو منزلہ مکان تھا ۔ جس کے آخری کمرے میں جسے گھر والے " پرلا اندر " کہتے تھے اس میں 4۔اپریل 1914ء کو " دلاور علی" نے پہلی سانس لی اپنے بچپن میں ہی انہیں اپنے اردگرد روایات کی دیواریں نظر آئیں ۔ جن کی گرفت میں خاندان کا ہر فرد تھا ۔ بچپن میں ہی انہوں نے اپنے دو تایا دیکھے جن میں سے بڑے فاتر العقل تھے اور دوسرے تایا جی اپنے آپ میں مست رہتے تھے ۔ اور ماں سارا دن ان کی دیکھ بھال کرتی رہتی تھیں

والد صاحب پیشے کے اعتبار سے درزی تھے ان کے مزاج کے بارے میں میرزا
ادیب لکھتے ہیں

" دنیا میں بعض ایسی جھیلیں بھی ہیں - جن کا پانی بیک وقت
شیریں بھی ہے اور کھارا بھی - ان کے ایک حصے میں جو پانی بہتا
ہے وہ میٹھا ہوتا ہے اور دوسرے حصے کا کڑوا ، کسیلا یا سخت نمکین
قدرت کا معجزانہ کمال یہ ہے کہ ان میں پانی کی دونوں سطحیں الگ
الگ رہتی ہیں - اس طرح ہر حصے کے پانی کا اپنا ذائقہ برقرار
رہتا ہے - میں جب بھی اپنے ابا جان کا خیال کرتا ہوں تو میرے
ذہن میں اسی قسم کی ایک جھیل کا تصور جاگ اٹھتا ہے -"[1]

میرزا ادیب اپنے والد کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ ہماری والدہ اور ہمارے
ساتھ بے رحمانہ اور سنگدلانہ سلوک روا رکھتے تھے لیکن جب ہم ہی سے
کوئی بیمار پڑ جاتا تو وہ ساری رات سو نہیں سکتے تھے اپنی چارپائی سے
اٹھ کر ہماری پیشانی پر ہاتھ رکھتے چارپائی پر جھک کر ہمارے منہ کے
پاس کان لے جاتے جیسے وہ ہمارے منہ سے کوئی فرمائش سننا چاہتے ہوں -

میرزا ادیب کے والد بہت سی محرومیوں کا شکار تھے - ان کے والد
پڑھے لکھے تھے جنہوں نے ورثے میں کتابوں سے بھرا ایک سرخ سفید

---

[1] میرزا ادیب - مٹی کا دیا ص 299

صندوق چھوڑا تھا ۔ لیکن مرزا کے والد اس علم کو پڑھ نہیں سکتے تھے ۔ زبان میں پیدائشی نقص کی وجہ سے وہ اپنا مافی الضمیر بیان نہیں کر پاتے تھے ۔ صرف مرزا ادیب کی والدہ ان کی یہ بات سمجھ لیتی تھیں ۔ وہ دوسروں سے بات کرتے وقت زبان اور ہاتھ کے اشاروں سے کام لیتے تھے ۔ ان کی نظر بھی بہت کمزور تھی ۔ لیکن اس کے باوجود وہ صبح کی نماز مسجد میں ادا کرتے تھے ۔ وہ نماز کی اہمیت سے باخبر تھے اس لیے اپنے بیٹے کو بھی اس سے کوتاہی کی اجازت نہیں دیتے تھے ۔ وہ شطرنج کے بڑے شائق تھے لیکن تاش سے نفرت کرتے تھے ۔ حقے کے رسیا تھے اگر کبھی ان کا عصا مخصوص جگہ پر نہ ملتا تو سب کی شامت آ جاتی ۔ ماہی گیری ان کا شغل تھا اپنی چارپائی کے نیچے ایک کنستر میں ریوڑیاں ، گنڈیریاں ، کھٹی میٹھی گولیاں مٹھائی وغیرہ رکھتے جن میں سے کبھی کبھی ریوڑیاں بچوں میں بانٹ دیتے لیکن بالوشاہی خود ہی کھا لیتے ۔ چنانچہ مرزا کو ان کی شفقت کا ایک واقع یاد ہے جب ان کے والد نے ریوڑیاں نکال کر اپنے منہ میں ڈالیں اور بالوشاہی " دلاور علی " کو دے دی ۔ اولاد سے محبت کا ہی ایک انداز تھا کہ وہ اپنی محرومیوں کے باوجود اپنے بچوں کی کڑی نگرانی کرتے کہ کہیں بچے بگڑ نہ جائیں ۔ مرزا ادیب لکھتے ہیں ۔

"محرومیوں کے شدید احساس نے انہیں بہت زود حس بنا دیا ۔ اپنی ہی آگ میں جلتے رہتے ، کڑھتے رہتے ، اپنے غم اور غصے

کے اظہار کا بہانہ ڈھونڈتے رہتے ۔ یہ سب کچھ غیر شعوری طور پر ہوتا ۔ کبھی کبھی اپنے کیے پر پشیمان بھی ہو جاتے ۔ ایسے موقع پر اپنے کنستر سے مٹھائی وغیرہ نکال کر بچوں میں بڑی دریا دلی سے بانٹ دیتے ---- بیماری بڑھ گئی تو دوا کھانی چھوڑ دی ۔ ایک دن نہ جانے انہیں کیا سوجھی کہ خود چارپائی سے نیچے اترے ۔ اپنا کنستر باہر نکالا ، تالا کھولا ، اور بڑی بیش کسو اشارے سے سمجھایا کہ اس میں سے سب کچھ نکال کر کھا لو اور ہم نے سب کچھ کھا لیا ۔ کئی منٹ تک خالی کنستر پر ہاتھ پھیرتے رہے ان کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور جب انہوں نے ہمیں دیکھا تو ان کے ہاتھ کنستر سے ہٹ کر ہمارے سروں پر پھرنے لگے ۔ ان کی بیماری بڑھ گئی ۔ ایک شام ان کی تکلیف بہت بڑھ گئی ۔ پیٹ کا اندرونی پھوڑا انہیں سخت اذیت دے رہا تھا ۔ دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر کہنے لگے اللہ میں مر جاوں ۔ مجھے یاد ہے وہ رات مجھ پر بہت بھاری تھی ۔ ابا جی کے لفظ یاد کرتے کرتے میں ضوظ اضطراب سے بار بار کروٹ بدلتا رہا ۔ تیسرے روز وہ فوت ہو گئے ۔"[1]

"دادی اماں کبھی موڈ میں ہوتی تھیں تو بتایا کرتی تھیں ۔ تمہارے

---

[1] میرزا ادیب "مٹی کا دیا" ص ۔ 309 ۔ 310

دادا جان بڑے عالم فاضل تھے اور ان کے باپ دادا افغانستان کے شہر قندھار سے آئے تھے۔ دادا جان اپنا سارا علم و فضل اپنے ساتھ قبر میں لے گئے تھے۔ اور ان کے علم و فضل کی نشانی پیتلے رنگ کا ایک صندوق تھا جو کتابوں اور قلمی مسودات سے بھرا ہوا تھا۔ دادی اماں نے یہ بھی بتایا تھا کہ ہمارے بزرگ لڑنے والے لوگ تھے۔ ہمارے بزرگ ضرور لڑنے مرنے والے لوگ ہوں گے۔ ضرور سپاہیانہ زندگی بسر کی ہوگی انہوں نے۔ لیکن ان کی نسل سپاہیانہ اوصاف سے یکسر محروم ہو چکی تھی۔ اس نسل کے کسی فرد نے بھی تلوار چھوڑ ایک بڑا چاقو تک نہ اٹھایا تھا۔۔۔۔۔ اب تو خاندانی تاریخ کا یہ ورق پرزے پرزے ہوکر بکھر چکا تھا۔۔۔۔ تایا جی اور ابا جی کو اپنے مغل ہونے پر فخر تھا۔ یہ فخر ایک ایسا اثاثہ بن گیا تھا جسے وہ محرومیوں کے لق و دق صحرا میں بھی اپنے سینوں سے چمٹائے ہوئے تھے۔ یہ تھی میری نسل جو آگے قدم نہیں اٹھا سکتی تھی کہ اس میں ایسی جرات ہی نہیں تھی پیچھے بھی نہیں ہٹ سکتی تھی کیونکہ اس کے لئے بھی سکت اور حرکت کی ضرورت تھی اور یہ بھی اس کے پاس نہیں تھی۔" [1]

میرزا ادیب آگے چل کر لکھتے ہیں۔

---

[1] میرزا ادیب۔ "مٹی کا دیا" ص= 15-16

"میں اس جمود زدہ نسل کا ایک فرد تھا جس کی پیدائش محض ایک عام واقعہ تھی - یہ میں تھا - دنیا انسانیت کی ایک اکائی. انسانوں کے سمندر کا ایک قطرہ وجود کے لاانتہا صحرا کا ایک ذرہ. ہماری خاندانی دائی مائی مُرادو نے میرے ہونٹوں سے شہد لگایا تھا - یہ شاید اس لیے کہ بڑے ہو کر زندگی کے زہر آلود قطرے میرے حلق سے نیچے اترنے والے تھے - یہ میں تھا - جسے اول تا آخر وقت کے طاق پر مٹی کا دیا بن کر جلنا تھا ----- یہ میں ہوں جو اس وقت ایک کاغذ پر جھکا ہوا ہوں ----- یا دوں کے ایسے جگنو جو چمک چمک کر غائب ہو جاتے ہیں اور یکایک پھر چمکنے لگتے ہیں - میرے ارد گرد اندھیرا تھا ---- جہالت کا اندھیرا ، قدامت پرستی کا اندھیرا ، خاندانی بے حسی اور جمود و تعطل کا اندھیرا ---- اور مجھے اندھیرے کی ان بلند دیواروں سے باہر نکلنا تھا ---- میری منزل ایک روشن دنیا تھی --- افق تا افق منور ، تابناک ، چمکتی دمکتی ہوئی - یہ میں تھا جو پہلے معار بہ عظیم کے ابتدائی زمانے میں پیدا ہوا اور جس نے ٹیگور کے الفاظ میں دنیا کو یہ خوشخبری سنا دی تھی کہ "ابھی خدا انسان سے مایوس نہیں ہوا - "[1]

---

[1] میرزا ادیب - "مٹی کا دیا" ص 16 - 17

ان اقتباسات کو پڑھتے ہی احساس ہوتا ہے کہ میرزا ادیب نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ ایک ادیب کے لیے ساز گار نہیں تھا ۔ ان کے بزرگوں کا ماضی شاندار تھا ۔ لیکن حال اس قدر الجھا ہوا تھا کہ جس میں ایک اطمینان بخش زندگی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا ۔ ان کے تایا جی اور والد صاحب کو اپنے مغل ہونے پر فخر ضرور تھا لیکن وہ کوئی ایسا قابل ذکر کارنامہ کر سکنے پر قدرت نہیں رکھتے تھے ۔ جو مغلوں کا تشخص تھا ۔ ان مایوس کن حالات میں صرف ایک ہستی ایسی تھی جو چاہتی تھی کہ اس کا " دلور" پڑھ لکھ جائے اور اپنے دادا جیسی عزت اس کے حصے میں بھی آئے ۔ یہ ہستی ان کی والدہ کی تھی جو ایک سیدھی سادی گھریلو خاتون تھیں ۔ جن کو گھر داری نے اپنے اندر ایسے رُجھا لیا تھا جیسے وہ اس کا ایک لازمی حصہ ہوں لیکن خود ان پڑھ ہونے کے باوجود وہ بیٹے کی تربیت سے غافل نہیں تھیں ۔

میرزا ادیب نے اپنی والدہ کا ذکر اس طرح سے کیا ہے کہ پڑھنے والا ان کے جذبات کو بخوبی سمجھ سکتا ہے ۔ والدہ کا ایثار اور محبت ایسی چیز ہے جس کی تڑپ اور گرمی کو انسان اس وقت سے ہی محسوس کرنے لگتا ہے ۔ جب وہ اپنے احساس وجذبات کے اظہار کے لیے کوئی واضع وسیلہ نہیں رکھتا ۔ میرزا ادیب اپنی والدہ سے والہانہ محبت کرتے تھے ۔ ان کے انتقال کے لمحے میرزا ادیب پر بے حد بھاری تھے ۔ وہ کہتے ہیں ۔

"مجھے وہ وقت کبھی نہیں بھول سکتا ! ـــــ زندگی کے آخری سانس تک بھی نہیں ۔ اس وقت کے ایک ایک لمحے کی کیفیت میرے دل پر طاری ہے ۔ ایک ایک لمحے کا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے پھر رہا ہے ۔ ------- صرف چند لمحے بیتے ہیں کہ ایک ہاتھ نے میرے بازو کو چھو کر کہا تھا ۔ بھائی جان نیچے آو ، ماں بلاتی ہے ------- آخری سیڑھی سے آگے چھوٹے دالان میں شمالی دیوار کے قریب ماں ایک چار پائی کے اوپر ایک سفید چادر اوڑھے لیٹی ہے ۔ آج شام ہوتے ہی اس نے خاموشی اختیار کر لی تھی ۔ اور میری تینوں بہنیں "بے بے" کہہ کر اس کے اوپر گر پڑی تھیں ۔ میں اس وقت مشرق دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا تھا ۔ میرے دل میں ایک طوفان برپا تھا ۔ خیال ہوتا تھا کہ ابھی سینہ شق ہو جائے گا ـــــ ابھی دل ریزہ ریزہ ہو جائے گا ـــ اسی لمحے اوپر آ گیا اور چار پائی کے اوپر گر پڑا ۔ طوفان آنسوؤں کی صورت میں آنکھوں سے بہہ گیا ۔ رونے کی آوازیں مسلسل آتی رہیں ۔ اور میں دم بدم پہلو بدلتا رہا ۔"[1]

میرزا ادیب اپنی والدہ سے متعارف کرواتے وقت قارئین کو بتاتے ہیں جب وہ بیاہ کر آئی تھیں اٹھارہ بیس برس کی لڑکی تھیں ۔ جنہوں نے اپنے والد کے سخت

---

[1] میرزا ادیب "مٹی کا دیا" ص۔ 267 ـ 268

گیر اصولوں کی وجہ سے گھر پر ہی قرآن مجید ایک بوڑھے مولوی سے پڑھا تھا - جب وہ نئے گھر میں آئیں تو خود کو اجنبی لوگوں کے درمیان پایا جو سب علم سے بے بہرہ تھے اور پرانی روایتوں کے اسیر بھی - شوہر پیشے کے اعتبار سے درزی، جن کی طبعیت تند تھی - پندرہ بیس دن کام پر جاتے اور باقی دن دکان کے انچارج سے روٹھ کر گھر پر رہتے - ساس، پرانے زمانے کی لکیر کی فقیر روائیتی ساس تھیں - میرزا ادیب کی والدہ جب بیاہ کر اس گھر میں آئیں تو انہیں بتایا گیا کہ ان کے سسر مرحوم بڑے عالم فاضل آدمی تھے اور سارا شہر ان کی عزت کرتا تھا - وہ ایک وکیل کے منشی تھے امی اپنے سسر پر فخر کرتی تھیں - انہیں حسرت تھی کہ کاش وہ اپنے سسر کی زندگی میں اس گھر میں بیاہ کر آتیں - وہ ایک خدمت گزار خاتون تھیں - جیٹھوں کی خدمت کرتیں - وہ نماز کی پابند ، مہمان نواز ، حوصلہ مند خاتون تھیں جنھوں نے زندگی کے سرد و گرم کو حوصلے کے ساتھ برداشت کیا -

میرزا بچپن میں کچھ عرصہ اپنی دادی کے گھر رہے لیکن جب گھومتے پھرتے اپنے گھر کے دروازے پر آ جاتے تو بیقرار ماںتا اپنی محبت سے انہیں سیراب کر دیتی - میرزا کو پڑھانے میں سب سے زیادہ ان کی والدہ کی خواہش اور کاوش کا عمل دخل ہے -

"امی مجھے اسکول جاتے ہوئے اسکول سے آتے ہوئے بستہ گھر کی واحد آہنی کرسی پر رکھتے ہوئے پاتیں تو عجیب نظروں سے مجھے

دیکھنے لگتیں ۔۔۔۔ امی کی یہ مسکراہٹ فخر و غرور کی مسکراہٹ
تھی ۔ انہیں کیوں نہ فخر و غرور ہوتا ان کے بچے نے جہالت کے
اندھیروں سے نکل کر علم کی روشن دنیا میں قدم رکھا تھا اور پورے
خاندان میں یہ فخر صرف انہی کے حصے میں آیا تھا ۔ علم سے
بے بہرہ ہونے کے باوجود علم کے لیے ان کے دل میں بڑا احترام
تھا ۔ دادا جان نے اپنی کتابوں کا ذخیرہ ایک لکڑی کے صندوق
میں محفوظ کر دیا تھا ۔ میں دیکھتا تھا کہ امی ہر دوسرے تیسرے
دن کپڑے سے اسے صاف کرتیں اور سوائے میرے کسی کو اسے کھولنے
کی اجازت نہ دیتیں ۔ میں صندوق سے کوئی کتاب نکالتا تو وہ بڑے
یقین افروز لہجے میں کہتیں ۔ دلور ! تو بڑا ہوگا تو ان کتابوں کو
پڑھے گا ۔۔۔ تیرا دادا جو تھا نا ، بڑا ہی لیک نیک تھا ۔۔۔۔
وکیل کا منشی تھا " [1]

میرزا کے والد نے دو مرتبہ غصے میں آ کر ان کا بستہ بھٹی میں جھونک دیا
تو ان لمحوں میں میرزا کی والدہ نے انہیں آگ کے شعلوں سے بچانے کی
کوشش میں اپنی انگلیاں جلا لیں ۔ کیونکہ وہ اپنے بیٹے کو بہر حال پڑھا لکھا
انسان دیکھنا چاہتی تھیں ۔ وہ اسے باو بنانا چاہتی تھیں ۔ ؟

"امی کی وہ خوشی مجھے کبھی نہیں بھولتی ۔ جب میں نے اپنی
اولین تصنیف "صحرا نورد کے خطوط" کا انتساب ان کے نام کیا ۔۔

---

[1] میرزا ادیب ۔ "مٹی کا دیا " ص ۔ 276

اس وقت میں نے نہیں کسی عزیز رشتہ دار یا ہمسائے نے یہ بات ان سے کہہ دی - بولیں " دلورا تو نے میری کتاب لکھی ہے ؟ ان لمحوں میں ان کا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا ـ میں نے کہا ، امی ! آپ کی کتاب لکھی نہیں ـــــ اپنی کتاب آپ کے نام کی ہے اسے کہتے ہیں انتساب ! میں نے کتاب کی پہلی جلد انہیں دی تو وہ دیر تک اسے دیکھتی رہیں ــ اس کی ورق گردانی کرتی رہیں ــ اس کے بعد تو یہ صورت ہوگئی کہ گھر میں جو شخص بھی آتا ، اس سے ضرور کہتیں - میرے دلور نے میری کتاب لکھی ہے - محلے میں کسی کے گھر جاتیں تو یہی بات کہتیں - کتاب کو میلے ہاتھ نہ لگاتیں - اور نہ کسی کو لگانے دیتیں ـــــ جب بھی اسے ہاتھ میں لیتیں ، ان کی آنکھیں چمک اٹھتیں ـ " [1]

میرزا ادیب نے جذبات انسانی کو جس سلیقے سے اپنی تحریروں میں اجاگر کیا ہے قاری نے اسی شد و مد سے انہیں محسوس کیا ہے اس سلسلے میں ڈاکٹر بشیر سیفی لکھتے ہیں -

" مرزا ادیب نے اپنی بہن اور بیوی کے ذکر پر رلایا بھی ہے - انہوں نے جس طرح جذبات میں ڈوب کر اپنے پیاروں کا ذکر کیا ہے - پڑھنے والا بھی اسی جذباتی سطح پر ان کے تاثر کو قبول

---

[1] میرزا ادیب - " مٹی کا دیا " ص - 296 - 297

کرتا ہے ۔ اور کسی مصنف کی اس سے بڑی کامیابی اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ وہ قارئین کو اپنے جذبات واحساسات میں اس طرح شریک کرے کہ مصنف کی واردات قاری کو اپنی واردات محسوس ہونے لگے ۔"[1]

دلاور علی بچپن میں جن ناسازگار حالات کا شکار رہا وہ محض اس فرد کا المیہ نہیں ہیں بلکہ اگر گہرائی میں جائیں تو فرد کے حوالے سے پورے ایک عہد کی تصویر نظر کے سامنے پھر جاتی ہے ۔ آج کا میرزا ادیب اور کل کا دلور جن حالات کا شکار رہا ہے ۔ اس کی شخصیت پر اس کے منفی اثرات بھی مرتب ہو سکتے تھے ۔ لیکن حالات کی چکی میں پس کر وہ معصوم دلاور علی جس کی شہرت کا کوئی امکان نہیں تھا وہ بہت ہی ناموافق حالات اور موروثی افلاس کے باوجود آسمان شہرت پر چاند بن کر چمکا ۔ ایک وہ عہد تھا جب خاندانی افلاس کے ہاتھوں مجبور ہو کر اسے استاد سلطان بڑھئی کے سپرد یہ سوچ کر کر دیا گیا کہ کل کو یہ "ترکھان" بن جائیگا ۔ لکھتے ہیں ۔

"دادی اماں نے اپنی اس شاگردہ کے ذریعے سلطان کو گھر پر بلایا اور مجھے اس کے سپرد کرتے ہوئے کہا ۔ پتر اسے اپنے جیسا استاد بنا دے ۔ اپنے سے بڑا استاد بناوں گا اماں ! سلطان نے یقین دلایا ۔ پہلے روز دادی اماں پر احسان کرتے ہوئے سلطان خود گھر پہنچا اور مجھے ساتھ لے گیا ۔ کھوکھے کے اندر قدم رکھتے ہی میرے دماغ

---

[1] بشیر سیفی ۔ "تنقیدی مطالع" لاہور نذیر سنز پبلشرز ۔ ص ۔ 99

میں ایک ایسی بدبو گھس گئی کہ میں بری طرح پریشان ہوگیا
چاہا کہ فوراً بھاگ جاوں مگر سلطان نے مجھے زمین پر بیٹھنے کا
اشارہ کر دیا میں بیٹھ گیا ۔ ہم اسے استاد کہتے ہیں ۔ استاد کا
پہلا حکم یہ تھا کہ حقہ تازہ کر کے لاو ۔ میں نے اپنے گھر میں ابا امی
کو حقہ تازہ کرتے ہوئے دیکھا ضرور تھا ۔ مگر خود یہ کام کبھی نہیں کیا
تھا ۔ سخت پریشان ہوگیا ۔ کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ استاد کے دو
شاگرد آگئے ۔ وہ ایک سے مخاطب ہو کر بولا ۔مردود و حقہ تازہ کرو ۔
استاد نے مجھے آگ جلانے کے لیے کہہ دیا یہ اور بھی مشکل کام
تھا ۔ استاد نے بھانپ لیا کہ میں اس کام میں بھی اناڑی ہوں تو
اس نے یہ حکم بھی اپنے دوسرے شاگرد پر صادر کر دیا ۔ یہ استاد
عجیب آدمی تھا ۔ وہ ہر شاگرد کو ۔۔۔۔۔ عام طور پر او لونڈے
کہہ کر بلاتا تھا ۔ اس نے کام سکھانے سے پہلے حقہ تازہ کرنے
آگ جلانے اور چلم بھرنے کا فن سکھایا ۔ کہا کرتا تھا او لونڈے !
حقہ تازہ نہیں کرو گے تو کام کیسے سیکھو گے ۔۔۔۔۔ چھٹے روز استاد
نے مجھے رندے سے لکڑی صاف کرنے کا سبق دیا "اے لونڈے !
اب خود کام کر ۔ میں نے رندہ لکڑی پر پھیرا وہ لکڑی کے آخر میں
پہنچ کر رک نہ سکا ۔۔۔ آگے خلا تھا میں اس کے ساتھ آگے جو
بڑھا تو سامنے دیوار سے جا ٹکرایا ۔ استاد اور اس کے دونوں شاگرد
زور زور سے ہنس رہے تھے اور ان کے قہقہوں کی آواز تھمتے

کی طرح میرے کانوں پر ضربیں لگا رہی تھی ۔ "[1]

اس اقتباس کو پڑھتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ میرزا ادیب کی طبیعت بچپن ہی سے حساس تھی ۔ گو انہیں سلطان کے پاس بڑھئی کا کام سیکھنے اور ارشد خان کے پاس لوہار کا کام سیکھنے کے لیے بیٹھایا گیا اور وہ بھی اس کام کو سیکھنے کی کوشش کرتے رہے لیکن وہ اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکے کیونکہ قدرت نے ان سے یہ کام نہیں لینے تھے بلکہ ان پر پیچ راستوں سے گزرتے ہوئے ان کی شخصیت کو دلور سے دلاور اور دلاور سے میرزا ادیب بننا تھا ۔ میرزا ادیب نے حالات کی جو چکی پیسی ہے اور زندگی کے حقائق کو جس قدر قریب سے دیکھا ہے اس نے ان کے اندر نکھار پیدا کر دیا ہے ۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ان کے قلم میں احساس کو شکل محسوسات میں ڈھالنے کا ہنر در آیا ہے ۔

" مٹی کا دیا " میرزا ادیب کی تحریر بے حد جاندار ہے ۔ انہوں نے سادہ سادہ الفاظ سے اپنی نثر میں " سادگی و پُرکاری " کی خوبی پیدا کی ہے اپنے موضوع، ماحول کے مطابق الفاظ استعمال کیئے ہیں ۔ پوری آپ بیتی میں کہیں بھی الفاظ کے طوطا مینا نہیں بناتے بلکہ صاف ستھری زبان میں اپنا ما فی الضمیر واضح کر دیتے ہیں ۔ انہوں نے جذبات نگاری اور کردار نگاری ، منظر نگاری میں اپنی افسانہ نگاری اور ڈرامہ نویسی کی فطری صلاحیتوں سے اس

---

[1] میرزا ادیب ۔ " مٹی کا دیا " ص ۔ 27 ـ 28

طرح کام لیا ہے کہ قاری ان کی چھوٹی چھوٹی تفصیلات کو بھی پوری دلچسپی سے پڑھتا ہے۔ جس نے مصنف اور قاری کے درمیان زمان و مکان کے بعد کو ختم کر دیا ہے۔

انہوں نے اپنے ادبی سفر کی ساری تفصیلات کا ذکر کیا ہے اس کی ابتداء اور اس راہ میں پیش آنے والی مشکلات کو بیان کیا ہے۔ "مٹی کا دیا" پڑھنے کے بعد قاری میرزا ادیب کی شخصیت سے اس طرح واقف ہو جاتا ہے جس طرح ان کا کوئی ہمعصر یا دوست۔ جو ان کی زندگی کے سب پہلوؤں سے آگاہ ہو۔ ان کا اسلوب اُنکی شخصیت کا آئینہ دار ہے۔ جیسے جیسے ہم آپ بیتی پڑھتے جاتے ہیں ہمارے سامنے میرزا ادیب کا خاکہ ابھرتا چلا جاتا ہے۔ ہم ان کی سوانح حیات ___ پڑھ کر اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ہم ایک ایسے شخص کے بارے میں پڑھ رہے ہیں جس میں عاجزی و انکساری، شرم و حیا کے جوہر کوٹ کوٹ کر بھرے ہیں۔

جمیل احمد عدیل لکھتے ہیں۔

" "مٹی کا دیا" اسلوب کے اعتبار سے ادب کے اونچے سنگھاسن پر فائز ہے اور اس کا سبب یہی ہے۔ کہ آپ بیتی کسی محقق، نقاد، معلم، عالم، سائنسدان، سیاستدان کسی کی بھی ہو جب تک اس میں ادبیت موجود نہ ہو، ایسی ادبیت جس میں تخلیقیت کا راز مضمر ہو، کامیاب نہیں کہلا سکتی۔ اور "مٹی کا دیا" میں تو ضیائے اسلوب مکمل طور پر جلوہ فگن ہے۔" [1]

---

[1] جمیل احمد عدیل۔ سیاق و سباق ۔ ص 81۔82

کتاب کا دوسرا اور تیسرا حصہ جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے اس میں انہوں نے اپنے بے تکلف دوستوں کے ساتھ ساتھ ان ہستیوں کا ذکر کیا ہے جن سے انہیں انسیت اور عقیدت ہے۔ ان تحریروں میں ہمیں پر خلوص محبت اور عقیدت کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ غالباً "مٹی کا دیا" کے اس حصے کو تحریر کرنے کے بعد ہی ان کے دل میں "ناخن کا قرض" کے نام سے خاکے لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔

"میرے ہمدم میرے دوست" کے اکثر مضامین میں ان کی تحریر سے خاکہ نگاری کا گمان ہوتا ہے۔

میرزا ادیب نے اپنی خود نوشت سوانح حیات میں اپنی ذات کی تشہیر اسی حد تک کی ہے جس حد تک آپ بیتی " کا فن اس کی اجازت دیتا ہے اس آپ بیتی میں خود ستائی اور خود غرضی کا جذبہ چھایا ہوا دکھائی نہیں دیتا۔ بلکہ میرزا ادیب نے اپنی زندگی کا نچوڑ اس کتاب میں پیش کر دیا ہے۔ اور آپ بیتی پڑھتے ہوئے یہ احساس گہرا ہوتا چلا جاتا ہے کہ ہم واقعی ایک حقیقی تخلیق کار کی تحریر پڑھ رہے ہیں جس کی سطور میں بے رحمی اور نشتر زنی کی بجائے مثبت رویہ کار فرما ہے۔ میرزا ادیب کی شخصیت کی بہت سی جہتیں ہیں اور ان کے اسلوب کی بھی بہت سی جہتیں ہیں۔ انہوں نے اپنی اس تخلیق میں اپنے فن اور شخصیت کو یکجا کر دیا ہے۔ انہوں نے اپنے پرائمری سکول سے لے کر کالج کے شب و روز تک کو اس طرح

بیان کیا ہے کہ قاری اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود انہیں اپنی نظروں کے سامنے پروان چڑھتے ہوئے محسوس کرتا ہے - بچپن کی شرارتیں ہنو مان کے لڈو چرا کر کھانا - والد کی لاٹھی کا اپنی جگہ سے غائب کر دینا اس طرح کی شرارتیں ہیں جن سے انسان اپنے بڑھاپے میں محظوظ ہوتا ہے -

"میرا ایک دوست تھا جو اکھاڑے میں جاتا رہتا تھا ایک روز کہنے لگا دلاورا باداموں کی تھیلی لوگے ؟ میں حیران اس کی شکل دیکھنے لگا ----- کیسے - میں نے پوچھا کشتی لڑنا ہوگی - میں کشتی لڑوں گا ؟ پاگل تو نہیں ہوگئے - مگر وہ بات بڑی سنجیدگی سے کہہ رہا تھا - ہر جمعہ کو کشتیاں ہوتی ہیں - جیتنے والوں کو بادام دئے جاتے ہیں - اس نے یہ بھی بتایا کہ مجھے اس کے ساتھ کشتی لڑنا ہوگی اور وہ ہار جائے گا - اس کا بدن کسرتی تھا اور مجھے تو ذرا سا دھکا دے کر بھی گرا سکتا تھا - مجھے اس کی بات پر اعتبار نہیں آ رہا تھا - تاہم ایک نئے تجربے کی سنسنی خیزی میرے اندر مچل رہی تھی - اعلانچی نے اعلان کیا - دلاورا پہلوان محمد اشرف عرف شرفو سے کھیلے گا - دلاورا پہلوان ! ایک بار تو میرا سینہ کبوتر کی طرح پھول گیا - جی میں آئی کہ میرے لیے یہی کافی ہے یہ خوشگوار الفاظ زندگی بھر کانوں میں رس گھولتے رہیں گے - کھینچو اس نے ہدایت کی - میں نے ہاتھوں کو کھینچا اور اس کا سر زور سے میری چھاتی سے جا ٹکرایا آنکھوں تلے اندھیرا سا چھا گیا - مگر جلد سنبھل گیا - مجھے معلوم

نہیں پھر کیا ہوا کہ ایک دم شور ہوا ۔ وہ مارا ۔ اور میں نے اپنے آپ
کو اس کی چھاتی پر بیٹھے ہوئے پایا ۔ ایک بڈھے نے اٹھ کر مجھے
تھاپڑا دیا اور دوسرے بڈھے نے باداموں کا ایک لفافہ میرے ہاتھ میں
تھماتے ہوئے ہدائیت کی ۔ پتر زور کردا رہیں۔" [1]

اس واقع کو رقم کرنے کے بعد میرزا نے اس خواہش کا بھی اظہار کیا ہے کہ اگر کسی زمانے میں کسی صاحب نے نوری کشتیوں کی تاریخ لکھنے کا ارادہ کیا ! تو اسے میرے دنگل کو نہیں بھولنا چاہیے ۔ میرزا نے اس جگہ پر بہت سے کشتیوں کے داو پیچ اور دنگلوں کو بھی رقم کیا ہے ۔ اور پڑھنے والوں کی معلومات میں اضافہ

محبت ایک ایسا جذبہ ہے جو ایک دم سے دل میں بیدار ہوتا ہے کچھ لوگ اس کی مدھم آگ میں جل کر مزا لیتے ہیں ۔ اور کچھ اس آگ کو ہوا دے کر اور بھڑکا لیتے ہیں اور پھر اس آگ میں جل مرتے ہیں "جہان دانش" میں احسان دانش نے " " کا ذکر جس انداز سے کیا ہے وہ عشق کی دھیمی آنچ ہے ۔ جو انسان کے اندر ہی اندر دھکاتی رہتی ہے اور انسان کے رویوں کو مضبوط اور مثبت بناتی ہے ۔ اسکے مقابلے میں یادوں کی برات " میں جوش کا عشق ہمیں آگ کا الاوہ نظر آتا ہے ۔ جس کی لپٹیں انہیں بار بار اپنی طرف کھینچتی ہیں ۔ اور ان کے اندر وہ تڑپ پیدا

---

[1] میرزا ادیب۔ "مٹی کا دیا" ص 176 ۔ 177 ۔ 178

نہیں ہوتی ۔ جو ہمیں احسان دانش اور کسی حد تک میرزا ادیب کے ہاں نظر آتی ہے ۔ میرزا ادیب فطرتاً شرمیلے انسان ہیں لیکن انہوں نے اپنی زندگی کی رعنائیوں کو چھپایا نہیں ۔ وہ لکھتے ہیں ۔

" ایک بار جب مجھے دادی اماں کے گھر جانے کا اتفاق ہوا ۔ تو میں نے ان کی ایک نئی شاگردہ کو دیکھا ۔ اس نے ہاتھوں میں مہندی رچا رکھی تھی ۔ میں نے ان ہاتھوں کو دیکھا ـــ اور یکلخت میرے سامنے مہندی کے پتے جھلملانے لگے ۔ میری رگوں میں سوسری ہونے لگی ۔ اور میں نے شاید غیرارادہ اس کا ہاتھ پکڑ لیا ۔ اس نے اوئی کہہ کر ہاتھ کھینچ لیا اور بھاگ گئی ۔ میں جب بھی وہاں جاتا تھا اس کے ہاتھوں ہی کو دیکھنے کی کوشش کرتا رہتا مگر چوری چھپے ۔ دلاور تجھے مہندی والے ہاتھ اچھے لگتے ہیں نا ۔ میں حیران ہو کر اسے دیکھنے لگا ۔ اس نے مہندی والے ہاتھ میری آنکھوں کے سامنے پھیلا دیئے ۔ ہیں ناں ـــ ہیں ناں ـــ ہیں ـــ ناں ۔ "[1]

میرزا ادیب چونکہ شرمیلے انسان ہیں اس لئے اس کی " ہیں ناں " سے ہی گھبرا جاتے ہیں ۔ اس رومان میں بھی ان کی فطری شرم ، انکساری قائم رہی ۔ اور آپ اس کی " ہیں ناں " سے گھبرا کر رہ جاتے ہیں ۔

اسی طرح سے ایک تحریر " نرگس کے پھول " کے نام سے ان کی

---

[1] میرزا ادیب " مٹی کا دیا " ص ۔ 188 ۔ 189

آپ بیتی مٹی کا دیا " میں ملتی ہے ۔ آغاز میں انہوں نے لکھا ہے کہ "صحرا نورد کا پہلا افسانہ ادب لطیف کے ایک خاص نمبر میں چھپا تو اس کو بہت سراہا گیا ۔ بہت سے خطوط موصول ہوئے جو داد و تحسین سے بھرے ہوتے تھے ۔ لیکن ایک خط ایسا تھا جو ان کے دل کو ایک نئے تجربے سے شناسا کر گیا ۔ لکھتے ہیں

" انہی خطوط میں ایک نیلے رنگ کا لفافہ بھی تھا جس کی وجہ سے میرے ذہن میں جو لذت انگیز کسک یا کرب انگیز لذت پیدا ہوتی وہ ایک بڑی لمبی مدت تک محو نہیں ہو سکی تھی ۔ اور اب تو یہ محض ایک مبہم سی خلش بن کر رہ گئی ہے ۔" [1]

گو یہ خطوط کا سادہ سا سلسلہ تھا ۔ جو بعد میں شکوے ، شکائتیں ، شوخیاں اور بہت کچھ کہنے سننے کا ذریعہ بن گیا اور میرزا ادیب کی آنکھوں میں مسرتوں کے سنہرے غبار بھر گیا اور بعد میں حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ وہ تعلق بس کرب انگیز لذت دے گیا ۔

میرزا ادیب چاہتے تو اپنی محبت کی ان دونوں وارداتوں کو اپنے قارئین سے چھپا سکتے تھے لیکن انہوں نے جس سادگی سے محبت کی، اسی سادگی سے اس کا اعتراف بھی کر لیا ہے ۔

وہ چاہتے تو اپنی داستان حیات کو رنگین بنانے کے لئے اور بھی رنگینی کا اہتمام کر سکتے تھے لیکن یہاں پر بھی ان کی فطری انکساری نے انہیں جھوٹ

---

1 میرزا ادیب ۔ " مٹی کا دیا " ص۔ 342 ۔ 343

بولنے سے باز رکھا ۔ اور انہوں نے اپنی ذات کے گرد رنگینیوں کا ہالہ نہیں بنایا بلکہ جیسی زندگی گزاری اسے ویسے ہی بیان کر دیا ۔

لکھتے ہیں ۔

" کہنے والے کہیں گے کیا اس شخص میں اتنی جرات ہے کہ اپنے ڈھکے چھپے واقعات زندگی کو بے نقاب کر دے ؟ کیا اس کی زندگی میں اتنا کچھ ہے جسے دلچسپی سے پڑھا جائے اور کیا یہ ہم جیسوں سے ایک الگ تھلگ ، ایک منفرد شخصیت مانی گئی ہے ۔ خود نوشت سوانح عمری لکھنا ایک فساد انگیز امر ہے ۔ کسی مصنف کی کتابیں پڑھ پڑھ کر لوگ اس کے بارے میں ایک خاص تصور قائم کر لیتے ہیں ۔ اور جب یہ مصنف اپنے حالات میں خود کو اس خاص تصور کے برعکس پیش کرتا ہے تو پڑھنے والوں کو یا تو اتنی مایوسی ہوتی ہے کہ وہ کتاب مکمل پڑھے بغیر چھوڑ دیتے ہیں ــــ یا ایک آدھ کو تو اتنا غصہ بھی آ جاتا ہے کہ وہ اسے کھڑکی سے باہر نہ سہی کمرے کے باہر ضرور پھینک دیتا ہے ۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ یہ فساد انگیز حرکت کر چکا ہوں ۔" ــــہ[1]

میرزا ادیب نے " مٹی کا دیا " میں اپنی بیوی نجمہ میرزا مرحومہ کے نام ایک خط لکھا ۔ جس کا ایک ایک لفظ سے ان کی محبت اور اندرونی کرب کی غمازی ہوتی ہے

ــــہ[1] میرزا ادیب ۔ " مٹی کا دیا " ص ۔ 402

میرزا ادیب نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ ان کے ساتھ گزارا ماں کے بعد یہ دوسری عورت تھی جس نے انہیں ہمیشہ سراہا اور ان کے حوصلے کو بلند رکھا ۔ اس خط کو پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ میرزا ادیب آج بھی نجمہ کی کمی کو محسوس کرتے ہیں ۔ ان کی بیوی کو اس بات پر فخر تھا کہ وہ صحرا نورد کے خطوط" کے خالق کی شریک حیات ہیں ۔ انہوں نے زندگی کے سرد و گرم میں میرزا کا ساتھ ایک اچھی شریک حیات کی طرح نبھایا ان کے بچوں کی اچھی تربیت کی انہیں میرزا گھر میں اتنی محبت ملی کہ بیماری کو اپنی بد قسمتی کہتی تھیں ۔ وہ ابھی اور زندہ رہنا چاہتی تھیں ۔ لیکن موت نے مہلت نہ دی ۔ لیکن آج بھی میرزا کا دل اور ان کے بچے اور گھر کے در و بام نجمہ میرزا کو یاد کرتے ہیں ۔

مختصر یہ کہ " مٹی کا دیا " ایک بامقصد آپ بیتی ہے لیکن میرزا ادیب کا اسلوب اس قدر جاندار ہے کہ پڑھنے والا اسے اپنی ہی داستان حیات سمجھنے لگتا ہے اور کتاب جب ہی ہاتھ سے رکھتا ہے جب اسے ختم کر لے ۔ وہ اپنی داستان زیست کو کہیں درمیان سے بیان نہیں کرتے بلکہ وہ " دلاور طی " کو ڈھونڈ کر لاتے ہیں اور پھر اپنے مکان کے " پرلے اندر " کو بھی نہیں بھولتے جہاں وہ زندگی کی پہلی سانس لیتے ہیں ۔

ان کے گھریلو حالات ہوں ، کسی دنگل کا ہو یا کسی ادبی شخصیت کا تذکرہ ہو وہ اس کی تفصیل اسی طرح بیان کرتے ہیں جس طرح انہوں نے قدیم لاہور کے مناظر کی جیتی جاگتی تصویر کھینچی ہے ۔

انہوں نے اپنی زندگی کے سفر کو واضع الفاظ میں کاغذ پر منتقل کر دیا ہے ۔ انہوں نے جہاں سادہ اسلوب اپنایا ہے، جذبات اور واقعات کے اظہار میں عام فہم الفاظ کو استعمال کیا ہے ۔جس سے ان کی تحریر میں سچے اور کھرے پن کا تاثر گہرا ہو گیا ہے ۔ انہوں نے اپنی آپ بیتی کا نام " مٹی کا دیا " علامتی حوالے سے منتخب کیا ہے ۔ لفظ " مٹی " ان کے غیر ادبی پس منظر اور کمزور خاندانی رتبہ کا اظہار کرتا ہے ۔ جبکہ لفظ دیا روشنی کے وسیع تر معنوں میں استعمال کیا ہے ۔ یوں ایک ایسا دیا جو اپنی قدر و قیمت میں بظاہر مٹی کا ہے مگر اپنے اندر روشنی کے سب معتبر حوالے رکھتا ہے ۔ ان کی آپ بیتی ہے۔ دوسری طرف انہوں نے اپنے لیے درخت کا استمادہ استعمال کیا ہے ۔ جسکی جڑیں زمین میں ہیں اور جو پورا زمین سے اوپر ہونے کے باوجود اپنی اصل زمین سے جڑا ہوا ہے ۔ یہاں درخت کا استعارہ بہت بامعنی ہے ۔ جو ان کے انسانیت سے پیوستہ رشتوں ، زندگی کے متعلق انکے رجحانات اور محبت جیسے جذبہ سے وابستہ فطری عمل دخل کی غمازی کرتا ہے ۔

مجموعی طور پر " مٹی کا دیا " ایک بھرپور آپ بیتی ہے ۔ جس میں مرزا ادیب اپنے حالات ، واقعات اور روداد حیات کو جملہ تجربات کے حوالے سے بیان کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں ۔

قاری اور لکھاری کے درمیان موجود بعد کو پاٹنے میں وہ اس خوبی اور ہنرمندی سے غالب آتے ہیں کہ " مٹی کا دیا " پڑھتے ہوئے واقعات کا غیر

ہونا یا اپنی ذات کا واقعات سے جدا رہنا محسوس نہیں ہوتا ۔ ان کا اسلوب بیان سادگی وپرکاری بے خودی وہشیاری کے مطابق توانا اور بھرپور ہے اور زندگی کے واقعات کو باالترتیب بیان کیا ہے ۔ جس سے ان کی تحریر میں غیر شعوری طور پر مرتبہ تنظیم نظر آتی ہے ۔اور قاری مرحلہ وار آگے بڑھتا رہتا ہے ۔ تاآں کہ لفظ لفظ حیات کتاب ہو جاتی ہے ۔

"یادوں کی بـــرات "

زندگی ارتقا اور مسلسل تغیر سے عبارت ہے ۔ جس میں انفرادی اور اجتماعی دونوں پہلو ساتھ ساتھ چلتے ہیں ۔ کوئی بھی تخلیق ہو وہ اپنا اظہار چاہتی ہے ۔ آپ بیتی بھی ایک ایسی ہی تخلیق ہے ۔آپ بیتی میں مصنف براہ راست تو اپنی داستان حیات بیان کرتا ہے ۔ لیکن اندر ہی اندر وہ اپنے عـــہد اور ماحول کی بھی عکاسی کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ آنے والے عہد کے لیے بھی فضا سازگار بناتا ہے ۔ آپ بیتی کے ذریعے آنے والی نسلیں کسی قوم کی اجتماعی شخصیت اور طرزاحساس سے واقفیت حاصل کرتی ہیں ۔ یوں قاری کا اپنا طرزاحساس اور شخصیت دونوں تعمیر کے حلقے میں شامل ہونے لگتے ہیں ۔

ایک اچھا ادیب اپنے موضوع کے اچھوتے پن اور اسلوب کی قدرت سے اپنے قارئین اور سامعین خود پیدا کرتا ہے ۔ یوں ہم ان ہستیوں کی سوانح حیات پڑھتے ہوئے ادیب کو اپنی تخلیق (ادب) کے ذریعے معاشرہ پر اور معاشــرہ کو ادیب پر اثرانداز ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں ۔ "یادوں کی برات " اپنی ہیت ترکیبی میں ابلاغ کے جملہ پہلووں پر قادر نظر آتی ہے ۔ "یادوں کی برات " شبیر حسین جوش ملیح آبادی کی خود نوشت سوانح عمری ہے ۔جو پانـــچ

بنیادی حصوں میں منقسم ہے اور 780 صفحات پر مشتمل ہے - پہلا حصہ "چند ابتدائی باتیں" 26 ضمنی عنوانات پر محیط ہے - جس میں جوش کی ولادت کے واقعہ سے لے کر مذہب سے وابستگی تک کے مختلف مدارج درج ہیں - جوش ایک مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے مگر خود کو مذہب پرست نہ سمجھتے ہوئے بھی عمر بھر ایک خاص مسلک کے پیرو کار بنے رہے - وہ اپنی تحریر میں انفرادی طور پر خود کو موحد کہتے ہیں - لیکن غالب کی طرح آزادہ اور خود بین ہو کر بھی اپنے کیسے میں ترک رسوم کی دولت سے مالا مال نہ ہو سکے اور ساری زندگی صاحب ایمان ملحد نہ بن پائے -

یہ المیہ جوش کو فیض احمد فیض بھی نہیں بنا پایا - جوش عمر بھر اس نفسیاتی بحران میں مبتلا رہے - مذہب ، عورت اور شراب کے بارے میں انکی مریضانہ توجیہات انہی متعلق تعلیمات کا حصہ ہیں -

عبدالماجد دریا آبادی "یادوں کی برات" پر "ایک گندی کتاب" کے عنوان سے لکھتے ہیں -

"یہ برات ــــ البتہ اجڑ، دیہاتی گنوار کی ہو سکتی ہے جو ٹھرا دارو ، مہوے کی شراب پیئے ، گالی بکتے جھکتے چلے جاتے ہیں اور ان کے جسم سے بو کے فحش کے بھپکے چھوڑتے جا رہے ہیں - اس برات پر موزوں نام تھا - یادوں کی کوا کہار "[1]

---

[1] عبدالماجد دریا آبادی - "ایک گزری کتاب" 28 - جولائی 1973ء ص - 4

ماہنامہ فاران ، فروری 1973ء میں یادوں کی برات پر ماہر القادری نے بالتفصیل تبصرہ کیا ہے - جیسے لکھنو کے ہفت روزہ "صدق جدید" نے کئی قسطوں میں ایک ریٹھے کی سرگزشت کے عنوان سے شائع کیا ہے -

چند ابتدائی باتیں کے وہ حصے جو ملیح آباد ، لکھنو کی تہذیب اقدار ، ہندوستان سے پاکستان مہاجرت کے سیاسی ، محرکات ، انتہائی ہنگامہ خیز زندگی کے نشیب و فراز ، ایک شاعر کے فکری ارتقاء مذہب و معاشرت اور ادب کے بارے میں انکی آراء فرنگی سے نفرت وغیرہ سے متعلق ہیں - ادبی اور فنی نقطہ نظر سے نہایت جاندار اور اثر انگیز تاثیر رکھتے ہیں - محبت میں گندھی ہوئی کیفیات سطر سطر میں دامن گیر رہتی ہیں - یہاں جوش اپنے خیال کے اظہار پر مکمل طور سے قادر نظر آتے ہیں - ان کے تخیل کی پرواز عام مصنفین کے مقابلے میں کہیں بلند تر ہے - وہ الفاظ کے جدید و قدیم خزانوں سے پوری طرح متعف نظر آتے ہیں - یہی ان کا مخصوص اسلوب ہے - جو آئندہ تحریروں میں اور زیادہ نکھرا ہوا ملتا ہے - اور انکے زبان و بیان کا اسلوب غیر معمولی لگنے لگتا ہے - لیکن یہ اسلوب جوش کے ساتھ ہی دفن ہو گیا ہے - اس سلسلے میں سید حامد "جوش شخصیت کے آئینے میں" لکھتے ہیں -

" ایک پہلو اس کتاب کی افادیت کا جو بالکل غیر مشتبہ ہے - وہ اس کا پر شکوہ ذخیرہ الفاظ ہے - جوش زبان کے بادشاہ ہیں ان کے دربار میں الفاظ کے پرے کے پرے صف بستہ نظر آتے ہیں - ان میں فارسی الفاظ بھی ہیں اور ہندی بھی ایک طرف روز مرہ کے

الفاظ ہیں دوسری طرف کتابی لفات ۔" [1]

"یادوں کی برات کا دوسرا حصہ جوش ملیح آبادی کے خاندان اور ان کے حسب نسب سے متعلق ہے ۔ اس حصے میں جوش انتہائی پرجوش ، خود پسند اور مریضانہ احساس برتری میں مبتلا نظر آتے ہیں ۔ یہاں جوش کی نفسیات کھل کر سامنے آگئی ہے ۔اور نرگسیت کا ایک عنکبوت ہے جو ہمہ وقت تار تار شبیر حسین خان کو جوش ملیح آبادی بناتا جاتا ہے ۔ ڈاکٹر شبیط رضوی "جوش کا نفسیاتی مطالعہ " یادوں کی برات کی روشنی میں" کے عنوان سے لکھتی ہیں ۔

" جوش نرگسیت کا شکار تھے وہ آپ اپنے عاشق اور چاہے جانے کی بھرپور تمنا رکھتے تھے ۔اسی لیے یادوں کی برات ، میں انہوں نے کچھ ایسے شگوفے چھوڑے تاکہ ان کے بعد بھی موشگافیوں کے دروازے کھلے رہیں ۔اور لوگ ان کا نام ورد زبان کرتے رہیں ۔" [2]

جوش ایک جاگیردار پٹھان گھرانے کے چشم و چراغ تھے جہاں دولت کے ساتھ ساتھ علم و ادب کی بھی فراوانی تھی ۔یہ دونوں باتیں جوش کے طرز احساس میں اساسی حیثیت رکھتی ہیں ۔ جنکا اظہار ان کی تحریروں میں جا بجا ملتا ہے۔

---

[1] خلیق انجم ۔ " جوش ملیح آبادی ۔ تنقیدی جائزہ " ۔نئی دہلی انجمن ترقی اردو 1992ء ص۔ 89

[2] جوش ملیح آبادی خصوصی مطالعہ " مرتبہ قمر رئیس۔ دہلی ۔ جوش انٹرنیشنل سیمینار کمیٹی 1993ء ص۔ 312

جوش ایک جگہ لکھتے ہیں ۔

" لکھنو کے کمشنر یا گورنر نے ملیح آباد کے باب میں یہ جملہ نہایت ہی خوب لکھا تھا کہ ملیح آباد درہ خیبر کا ایک ایسا جزو ہے جس کا ہندوستان سے ابھی تک الحاق نہیں ہو سکا۔"[1]

" چند ابتدائی باتیں " اور میرا خاندان کے سرسری جائزہ سے یہ بات واضع ہو جاتی ہے کہ جوش کے ذہن و فکر کی ساخت کم عمری ہی میں واضع ہو گئی تھی ۔اور جوش کی شخصیت کے وہ بنیادی میلانات جنہوں نے ان کے طرز احساس کی تعمیر کی بچپن ہی سے اپنے ہونے کا اظہار کرنے لگے تھے ۔

" یادوں کی برات " کے تیسرے حصے میں جوش نے 33۔اہم احباب کو یاد کیا ہے یہ احباب بالواسطہ یا بلاواسطہ جوش ملیح آبادی کی زندگی پر اثر انداز ہوتے رہے ہیں ۔ " یادوں کی برات " میں جہاں جوش کی اپنی زندگی کے بنیادی میلانات اور اپنے بارے میں قطعیت کے ساتھ بیان شامل ہے ۔وہاں ان شخصیات کی جن کے بارے میں اس کتاب میں اظہار کیا گیا ہے ۔ نفسیات کو سمجھنے میں بھی بڑی مدد ملتی ہے ۔ زندگی کی وہ محرومیاں اور ذاتوں کے وہ کھوکھلے پن جو اندر ہی اندر آدمی کو پستہ قد بناتے رہتے ہیں ۔ اس باب میں ان کا مطالعہ دلچسپ ہے "یادوں کی برات" میں جوش جس قدر اپنی ذات

---

[1] جوش ملیح آبادی ۔ " یادوں کی برات " ص ۔ 29

کے بارے میں بیباک ہیں اسی قدر تلخ و شیریں اپنے احباب کے باب میں بھی واقع ہوتے ہیں ۔ یوں یہ کتاب محض الفاظ سازی اور دلچسپ واقعات کا افسانہ طراز بیان ہی نہیں بلکہ حقائق کی پردہ دری بھی کرتی ہوئی نظر آتی ہے ۔ گاہ گاہ جوش خود آئینہ بن گئے ہیں اور گاہ گاہ اپنے اردگرد موجود خلق خدا کو آئینہ بنا دیا ہے ۔ جس میں زندگی کے متضاد اور باہم متصادم رویے مسلسل عمل اور رد عمل کے وسیلے سے شخصیات کی بنت میں مصروف نظر آتے ہیں ۔ اگرچہ اس باب میں کہیں کہیں عبارت اور الفاظ پر غیر معمولی محنت نے اس کے مفاہیم کی بے ساختگی چھین لی ہے ۔اور قاری اس بات سے بے نیاز ہوگیا ہے کہ وہ ایک خود نوشت کا مطالعہ کر رہا ہے ۔ تاہم جوش اس کے سزاوار بھی ہوتے ہیں ۔ صدق جدید لکھتا ہے ۔

" میرے شہر نے شائد یہ قسم کھا رکھی ہے کہ جو بات بھی لکھوں گا اس میں اصلیت اگر ہو سکی تو بقدر نمک ہوگی ۔ باقی مبالغہ ، نمک مرچ ، افسانہ طرازی اور دروغ بیانی ۔" [1]

یادوں کی برات " کے چوتھے حصے میں جوش ملیح آبادی نے اپنے عہد کی عجیب و غریب ہستیوں کا ذکر کیا ہے اور آخر میں اپنے مشہور عالم اٹھارہ معاشقوں کی تفصیلات بیان کی ہیں ۔ 1975ء میں اس کتاب میں 53 صفحات کا

---

[1] صدق جدید " ہفت روزہ لکھنو ۔ 18 جون 1993ء ص 7

اضافہ کیا گیا - اور اپنے تازہ احوال رقم کیے ہیں - اس میں 29 احباب کا نام بنام تزکرہ ہے - جن میں جوش کی بیوی کا تزکرہ جس درد بھرے لہجے میں کیا گیا ہے قابل ذکر ہے - اس کے علاوہ ایک خاتون سے دلچسپ معاشقے کے قصے بیان کئیے گئے ہیں -

جوش نے اس کتاب کو تین مرتبہ لکھا - ایک مرتبہ کتابت بھی کروائی مگر مطمئین نہ ہوئیے سارے مسودات قلم زد کرنے کے بعد چوتھی مرتبہ یہ مسودہ اشاعت کے قابل سمجھا - انہوں نے حالات زندگی کی تدوین میں کامل 6 برس تک زیادہ تر مسلسل اور گاہ گاہ غیر مسلسل عرق ریزی کی - اجداد کی تلوار کو پگھلا کر قلم بنایا - شعر گوئی ، عشق بازی ، علم طلبی اور انسان دوستی کے اعلی آدرشوں سے تقریباً 86 برس تک اپنی زندگی میں رنگ بھرنے کی ریاضت کرتے رہے - مگر جوش کی شخصیت کئی حوالوں سے متازعہ بنی رہی - یہی حال انکی اس تصنیف کا ہے - وہ کوئی واضع فکر دینے میں کامیاب ہیں ہوئیے - نظم لکھتیے لکھتے جب نثر لکھنے بیٹھے تو آپ بیتی میں بھی خود کو شاعر ہی منواتے رہے اس سلسلے میں ڈاکٹر عقیل احمد لکھتے ہیں -

"جوش بنیادی طور پر شاعر ہیں مفکر نہیں وہ جذبے کے شاعر ، جس وقت جو جذبہ ان پر طاری ہوتا ہے - اس وقت کیلئے وہ صادق ہوتا ہے - اور وہ اس جذبے کی گرفت میں ہوتے ہیں - شدید جذبات اور افتاد طبع کی وجہ سے اہی ان میں اور شاعر میں متضاد عنصر ملتے ہیں۔" سے[1]

سے[1] عقیل احمد - ڈاکٹر - جوش کی شاعری کا تنقیدی تجزیہ - نئی دہلی موڈرن پبلشنگ ہاوس - 1993ء ص- 0

دراصل اس کتاب کا اصل وصف اسکی زبان ہے ۔اگرچہ اس پر بھی جوش کی شاعری کی طرح نقادوں نے اعتراض کئے ہیں ۔کہ وہ توپ سے چڑیا کا شکار کرتے ہیں ۔ لیکن جہاں اس کتاب میں مطالعہ سے شدید جدید الفاظ کی موسلا دھار بارش ہونے کا احساس ہوتا ہے وہاں عمدہ نثر اور بعض نہایت دلچسپ اور اثر پذیری سے معمور واقعات بھی سامنے آتے ہیں ۔ جو پڑھنے والے کی زندگی میں ہما ہمی اور تغیر ، تبدل پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اس کتاب کی زبان و بیان اور اسلوب غیر معمولی ہے ۔ جس سے قارئین متاثر ہوتے بغیر نہیں رہ سکتے ۔

یہاں چند ایک مثالیں قارئین کی دلچسپی کیلئے پیش خدمت ہیں ۔

" میں نے اجداد کی تلوار کو پگھلا کر قلم بنا لیا تھا ۔میرے بیٹے نے میرے قلم کو ہتھوڑے میں ڈھال لیا ہے ۔ ہائے میرے خاندان کا وہ عروج اور وائے یہ زوال ۔"

" اتنے میں وہ بھرے ہوئے ساغر کی طرف گئی پتلی پتلی اور لانبی لانبی سرخ انگلیوں سے اس نے ساغر اٹھایا ۔ایسا معلوم ہوا گویا بلوریں جھاڑ کے قلموں کے حلقے میں قمقمہ روشن ہو گیا ۔ساغر کے خطوں کی نبض چلنے لگی ۔ اور صہبا کی موجوں میں بھنور پڑنے لگے ۔

لیکن اکثر مقامات پر جوش اپنی علمی ہستی کے اظہار میں واقعات کی معصومیت نہیں سلامت نہیں رکھ پائے انکی واردات کو الفاظ اور عبارت کی غیر معمولی آرائش نے بے ساختگی سے دور کر دیا ہے ۔ " عشق بازی کے باب میں فحش

پسندی قلم کی جنبش پر غالب ہے - شاعرانہ تشبیہ بھی سوجھی ہے - تو پھکڑ
قسم کی پھبتی ہو کر -" [1]

اس سلسلے میں ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں -

" یادوں کی برات آزادانہ بیانی کا لذت انگیز مرقع ہے - اس کتاب میں حالات زندگی کا جزرو مد دیدنی بھی ہے اور شنیدنی بھی اور ان سے جوش کی خود مرکزیت زیادہ نمایاں ہے - لیکن بعض مقامات پر مشرقی اقدار کو ٹھیس لگتی ہے تو جوش کی جمال پسندی پر بھی ضرب پڑ جاتی ہے - یوں صاف اور معاشقوں کی - اس تفصیل سے جوش کی شخصیت ، فحش عیاری چھچھورے ، ابتذال ، پستی ، دنیا طلبی ، شدید مبالغہ آرائی جاہ طلبی منافقت اور سطحیت سے نکلی ہوئی معلوم ہوتی ہے -" [2]

ان کے مزاق میں لذت طلب تو ہے مگر وصل میں مرگ آرزو نہیں - وہ اپنے عیش کو عشق سمجھتے ہیں - یہی وجہ ہے کہ ان کے تمام معاشقوں میں ایک بھی دل پر اثر نہیں کرتا - اور محبت کے بارے میں کوئی واضح طرز احساس اجاگر نہیں ہو جاتا -

انسان دوستی کی ذیل میں بھی وہ کوئی واضح فکر دینے سے قاصر رہے ہیں وہ سرمایہ داری نظام کے خلاف اشتراکی نظام کو دکھی انسانیت کا نجات دہندہ سمجھ

---

[1] عبدالماجد دریابادی - "ایک گندی کتاب" 14 - اگست 1973ء ص- 14

[2] انور سدید - ڈاکٹر - اردو ادب کی مختصر تاریخ - اسلام آباد مقتدرہ قومی زبان 1991ء ص- 617

ہیں - مگر ان کی اپنی ساری زندگی عیش کوشی اور نرگسیت کے مریضانہ ماحول میں گھری ہوئی نظر آتی ہے - وہ دن بھر علم طلبی میں سرگرداں تو رہے مگر جاہ طلبی کے سحر سے باہر نہیں پائے اور شب بھر عیش کو عشق کے نام سے منسوب کرتے رہے - اعلیٰ حسب نسب کا کیڑا ساری عمر ان کے دماغ میں بہ حسن تمام موجود رہا - فرنگی سے نفرت اور وطن پاک کی محترم اور نہایت بلند کردار ہستیوں سے بیزاری ایک ہی کیفیت کے دو رخ معلوم ہوتے ہیں جو ان کی غیر متوازن سوچ اور فکر کی غماز ہیں - ان کی زندگی ایسی عدم توازن میں گھٹی ہوئی حبس زدہ حویلی لگتی ہے - جس میں درو دیوار خود گھٹن پیدا کرنے کے عمل میں شریک نظر نظر آتے ہیں -

اگرچہ مذہبی حلقے سے تعلق رکھنے والے نقاد حضرات نے اس کتاب پر شدید تر تنقید کی اور اس کتاب میں موجود حسن و خوبی کے ہر حوالے کو رد کر دیا اور فحش گوئی کا ایک بھر پور تاثر اس کتاب سے ہمیشہ کے لیے وابستہ تعمیر ہو گیا مگر اپنے دیگر پہلوؤں میں "یادوں کی برات" اثر پذیری کا تاثر لیے ہوئے ایک اعلیٰ ادبی مرقع ہے - جس نے بہت کم عرصہ میں بہت زیادہ شہرت پائی چونکہ جوش خود متنازعہ تھے - لہٰذا ان کی تخلیق بھی متنازعہ بنی وہ بہت سی باتوں کو ناگفتنی چھوڑ گئے ہیں جس کا انہیں قلق ہے - مگر جتنا کچھ ان کے کے قلم سے گفتنی بنا ہے شاید ہماری تہذیب کی ریا کاری اور نقاب در نقاب طرز بیان کے لیے مشکل سے ہی قابل قبول ہوگا -"[1]

---

[1] وحید اختر - ڈاکٹر - ہماری زبان - علی گڑھ - 22 جنوری 1972ء ص 11

مجموعی طور پر یادوں کی برات " خود نوشت سوانح عمری کی ادبی تاریخ میں تا حال صف اول کی کتابوں میں سے ایک ہے۔ جس نے نہایت مختصر عرصہ میں ایک وسیع حلقہ اپنے چاہنے والوں کا بنا لیا ۔اور ابھی تک خود نوشت سوانح عمری کے تخلیقی و تنقیدی سفر میں اسباب سفر بنی ہوئی ہے۔ یہ کتاب اپنے موضوعات کا بہترین نفسیاتی مطالعہ بھی پیش کرتی ہے۔

"یادوں کی برات، جہان دانش اور " مٹی کا دیا " کا تقابلی جائزہ

زندگی کسی چیز کی ریہرسل کا نام نہیں لیکن واقعات ہر لمحہ زندگی کے رد عمل کی ترجمانی کرتے ہیں ۔ اس بات کا مطلب یہ ہے کہ انسان سے متعلق زندگی کی جملہ صورتیں اپنی اصلی اور حقیقی حالت میں شب و روز وقوع پذیر ہوتی ہیں اور ہم ان میں دانستہ یا نادانستہ سرزد ہونے والی اپنی نادانیوں اور غلطیوں کا ادراک کرنے کے بعد انہیں اپنی زندگی سے کاٹ کر الگ نہیں کر سکتے ۔ انکی مثال اس طرح ہے کہ زندگی ایک تسبیح ہے اور سانس اس تسبیح کے دانے ۔ یہ دانے انسان کی پستیوں اور بلندیوں سے مزین ہیں اپنی گزشتہ پستیوں کا شعور ہو جانے پر ہم تسبیح کے ان دانوں کو تسبیح سے نکال باہر نہیں کر سکتے ۔ البتہ ہم اپنی نادانیوں کا کھلے دل سے اعتراف کر کے اپنے گرد و پیش اور خود سے وابستہ بالواسطہ دیگر ہم نفسوں کو زندگی کا شعور اپنی ذات سے وابستگی کا احساس اور خود اپنے بارے میں درست معلومات کی ترسیل کے ترجمان بن سکتے ہیں ۔ یہ کام بظاہر بہت پر پیچ ہے مگر اس میں حقیقی مقصد کے جملہ تخلیقی پہلو موجود ہیں ۔ جب ہم اس زاویہ سے " یادوں کی بارات " از جوش ملیح آبادی ، " جہان دانش " از احسان دانش اور " مٹی کا دیا "

از میرزا ادیب کی آپ بیتیوں کا تقابلی جائزہ لیتے ہیں تو احسان دانش اور میرزا ادیب تقریباً ایک ہی تہذیبی فضا میں سانس لیتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ اگرچہ اس مطابقت سے ذرا پرے ان اصحاب کے پروان چڑھنے کے حالات و واقعات اور پیش آمدہ ماحول مختلف ہے تاہم ان کے طرز احساس کی تخلیق ایک دوسرے کے ماحول اور جملہ حالات و واقعات کی توسیع ہے۔ "جہان دانش" کے مطالعے سے یہ بات عیاں ہے کہ احسان دانش کی باولی میں درسی تعلیم کی گہرائی واجبی سی تھی وہ اپنے پیش منظر میں نہ تو اعلیٰ حسب نسب والے کسی خاندان کا پس منظر رکھتے ہیں اور نہ ہی انہیں وراثت میں علم کی راجدھانی ملی ہے۔ ان کی تہذیبی روایات میں محنت، مشقت، اور جانگسل مزدوری شامل ہیں۔ وہ صدیوں، سالوں، مہینوں اور دنوں میں بٹی ہوئی زندگی میں اپنے تجربات اور مشاہدات کے علم سے مالا مال ہوئے۔ اور اردو ادبیات میں ایک ایسا اسلوب چھوڑ گئے جس کا دامن آج بھی اپنے سچے پن سے معطر ہے۔ کچھ یہی کیفیت "مٹی کا دیا" کی ہے۔ میرزا ادیب کو بھی ورثے میں ناسازگار معاشی حالات ملے اگرچہ دادا کی علم دوستی نے میرزا ادیب کو ایک "دیے" جتنا روشن ادبی پس منظر ضرور عطا کر دیا تھا جس کی روشنی میں وہ کالج تک پہنچ گئے۔

لیکن درسی تعلیم و تربیت کی جدوجہد میں مالی اعانت ان کی والدہ کے ہاتھوں ہوتی رہی۔ وہ اپنے تہذیبی حوالوں میں جوش کے مقابلے میں احسان دانش کے زیادہ قریب ہیں۔ ان دونوں سوانح عمریوں کو دیکھیں تو ان میں ماں کا کردار ایک جیسا محسوس ہوتا ہے۔ ان احباب کا سادہ اور بے تکلف گھریلو ماحول ان کے

اسلوب کا حصہ ہے - ان کے لب ولہجے میں ان کی زندگی کا اصل رنگ بہت واضح ہے - اور تحریر میں کہیں بھی ان کی شخصیات ان کے زبان وبیان پر حاوی نہیں لگتیں - جوش کا معاملہ دوسرا ہے - انہیں ترکہ میں ادبی اور مالی آسودگی کے ساتھ اعلی حسب نسب اور بڑے خاندان کی روایات ملی ہیں - انہوں نے انسویں صدی کو غروب ہوتے ہوئے دیکھا ہے اور وہ اس صدی کی تہذیبی روایات کو بیسویں صدی میں ساتھ لے کر داخل ہوئے ہیں - ان کی پر شکوہ زبان وبیان انکے عہد کے رجائی اضمحلال کی نمائندہ ہیں - اور وہ اپنے طرز اظہار میں خاندانی جاہ وجلال اور تمکنت کو در آنے سے روک نہیں پائے - ان کے لب ولہجے میں بلند آہنگی ملیح آباد کی ہندوستان میں عدم شمولیت کا اعلان کرتی ہے - اور ان کی علمی حیثیت ان کی تحریروں میں رعونت کی حد تک پھیلی ہوئی نظر آتی ہے - زبان و بیان کے حوالے سے دیکھیں تو جوش کی تحریریں اردو زبان بیان کی قدیم وجدید لفظیات سے بھری پڑی ہیں جن کے پس منظر میں لکھنوی لب ولہجے کا آہنگ موجود ہے ـــــ ان کے ہاں لفظ کا استعمال انگوٹھی میں نگینہ جڑنے کے مترادف لگتا ہے - لفظ ان کے ہاں ہاتھ باندھ کر قطار اندر قطار کھڑے نظر آتے ہیں - اور وہ کیفیت کے بھرپور اظہار سے معمور لفظ کو اپنی تحریر میں جگہ دیتے ہیں - منظر کشی اور چیزوں سے جذباتی وابستگی کا اظہار ان کے ہاں نہایت اعلی اور بھرپور تاثر کے ساتھ موجود ہے - انہیں لفظ کی معنوی حیثیت اور کیفیت کی معروض کمیت کے درمیان ربط کی تخلیق کا پورا ہنر آتا ہے - اور حرف جوش کے فکری سانچے میں اس طرح ڈھل جاتے ہیں کہ ابلاغ

کا جوبن ہر ہر سطر میں بہتا جاتا ہے ۔ لیکن اس کے باوصف جوش کی تحریروں میں کہیں کہیں بناوٹ اور عبارت سازی کا گمان گزرتا ہے ۔ اس حوالے سے ان کے ادبی تخلیقی نظریے سے اختلاف الگ بات ہے مگر یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ جوش کو ابلاغ کا کبھی بھی مسئلہ در پیش نہیں رہا ۔ وہ اپنا ماضی الضمیر قاری تک منتقل کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں ۔

" یادوں کی برات " کے صفحات پر ایسی ہزاروں مثالیں قاری کے بغل گیر ہونے کو بے تاب نظر آتی ہیں ۔ معاصر آپ بیتیوں میں جہان دانش " کا مقام کے باب میں " یادوں کی برات " کے اس وصف پر ہم سیر حاصل گفتگو کر چکے ہیں ۔ یہاں اس باب کی ضرورت کے حوالے سے دو ایک مثالیں پیش کرتے ہیں ۔

" یادوں کی برات " میں جوش موسم برسات کے متعلق اس طرح لکھتے ہیں۔

" جھومتی ، چھمکتی ، چھولتی ، جھر جھراتی ، چھم چھماتی ، جھم جھم برستی ، جوبن والی ، جوشش برسات ، گھپ اندھیروں اور گھنگھور گھٹاؤں میں گھرتی ، گھومتی ، کھمرتی ، گنگناتی ، گمکتی گاتی ، گرجتی ، گونجتی ، گھڑ گھڑاتی ، گھونگر والی برکھا ۔۔۔۔ اللہ اللہ وہ مچلتی گھٹائیں ، وہ چڑھتے دریا ۔ وہ گرجتے نالے ، وہ تھرکتے ولولے وہ کوکتی ترنگیں ، وہ ابلتی امنگیں وہ چمکتے رنگ ۔۔۔ اور وہ زبردست پُرشور دونگڑے اور ایسی گرجتی پروائی کہ دھرتی بولے رام دہائی ! جب موسلا دھار پانی برسنے لگتا تھا ۔" [1]

---

[1] جوش ملیح آبادی " یادوں کی برات " ص ۔ 66

"یادوں کی برات" کے اس نثری ٹکڑے سے جہاں ہمارے متذکرہ موقف کی توثیق ہوتی ہے وہاں اس بات سے الگ ان لفظوں میں نثری محاسن کی ایک رنگین دنیا آباد ہے - موسم برسات کی جملہ کیفیات کا جس قدر بھرپور اظہار اس ادب پارے میں موجود ہے اس سے بڑھ کر لفظ گ ، ھ ، ت اور ی کے یکے بعد دیگرے استعمال سے اور ان حروف کی تکرار نے وہ صوتی اثرات پیدا کیئے ہیں کہ خود لفظوں میں برسات کی کیفیات در آئی ہیں - گویا ان لفظوں کی تکرار سے پیدا ہونے والی آوازیں بجائے خود برسات کے موسم کی صدائیں لگنے لگتی ہیں - یہ خوبی بہت کم نثر پاروں میں دیکھنے کو ملتی ہیں -

"یادوں کی برات" کے تعارف میں جوش لکھتے ہیں -

" میں نے بجھتے ہوئے حافظے کے تہ در تہ پیچیدہ اور گھورا ندھیروں میں ٹٹول ٹٹول کر یہ سفر طے کیا ہے - ان اندھیاروں میں میرے حالات اس قدر الجھے اور ایک دوسرے پر چڑھے ہوئے ملے کہ یہ پتا نہیں چلتا تھا کہ کون واقعہ مقدم ہے کون موخر ——— میں نے اپنے بڑھاپے کو بچہ بنا کر اپنے ماں باپ کے آغوش میں بٹھایا ----اور ماضی سے اپنے کو جب ڈسوا چکا تو قلم کو خون میں ڈبو ڈبو کر سب کچھ قلم بند کر لیا ——— اور آپ کو سنانے بیٹھ گیا -" [1]

---

[1] جوش ملیح آبادی - "یادوں کی برات" لاہور مکتبہ شعر و ادب مئی 1975ء
ص - 12

جوش کے اس بیان کی صداقت یا دروغ گوئی اپنی جگہ پر الگ بحث کی گنجائش رکھتی ہے - مگر بجھتے ہوئے حافظے ـــــ تہ در تہ پچیدہ گھور اندھیروں بڑھاپے کو بچپن بنا کر ماں باپ کی آغوش میں بیٹھانا - کے تلازمات نے جس منظر کی عکاسی کی ہے وہ سرا سر سچا اور حقیقی ہے - انفرادی لاشعور کی جن فضاوں سے حافظے کے زور پر جوش نے جن یادوں کی برات سجائی ہے اسکی فنی اور تکنیکی راستی سے انکار ممکن نہیں جوش کی تحریروں میں تخلیقی فنکارانہ پن پوری ادبی تب و تاب کے ساتھ موجود ہے - "یادوں کی برات" پر فحش اور ایک گندی کتاب ہونے کی پھبتی اپنے سیاق و سباق میں کس قدر سچی کیوں نہ ہو اس آپ بیتی کی ادبی حیثیت مسلم ہے -

دوسری طرف "جہان دانش" کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ یادوں کی برات اور مٹی کا دیا" کی طرح "جہان دانش" کے واقعات میں بھی سنین کا کوئی التزام نہیں رکھا گیا - زبان و بیان کے حوالے سے "جہان دانش" میں اردو ادب کے نئے پرانے الفاظ کے ساتھ کاندھلہ اور اس کے گرد و نواح میں بولی جانے والی بولیوں کا لب و لہجہ بھی پایا جاتا ہے - علاقائی لب و لہجہ کی چاشنی نے "جہان دانش" کی زبان و بیان کو ایک الگ شناخت عطا کر رکھی ہے ان کے اسلوب نے واقعات میں سچے پن کی ایک الگ تاثیر پیدا کر دی ہے - احسان دانش کے ہاں لفظ اگرچہ متنوع ہیں مگر ان کا استعمال کسی تصنع اور خصوصی محنت کے بغیر کیا گیا لگتا ہے - ان کی تحریروں میں نثری جھول سے پاک

جملوں کی نشست و برخاست اور الفاظ کی بندش نے اظہار کو گزشتہ سے پیوستہ رکھا ہے ۔ واقعہ کو جس طرح انہوں نے بیان کیا ہے اور ایک دوسرے کے ساتھ جوڑا ہے اس نے بہت وقت گزر جانے کے بعد بھی واقعہ کے حقیقی تاثر کو قائم رکھا ہے ۔

احسان دانش کے ہاں بیان اپنے مفہوم کا بھرپور انداز میں احاطہ کرتا ہوا نظر آتا ہے ۔ جہان دانش کے حالات و واقعات چنیدہ اور منتخب ہیں ، مگر ان کو پڑھ کر ایک بہترین فلم کو دیکھنے کا احساس ہوتا ہے جس میں ہیرو کی انفرادی زندگی کے جملہ پہلو اور اس سے وابستہ بل واسطہ یا بلاواسطہ اجتماعی زندگی کھل کر سامنے آ جاتی ہے ۔ لیکن اس فلم کا مقصد اشتہار کی سطح سے بلند تر رہتا ہے اس طرح وہ وسعت جو احسان دانش کی نگاہ میں تھی ان کی تحریروں میں ابھر آتی ہے ۔

" احسان دانش " اور " یادوں کی برات " کی زبان و بیان میں ایک فرق ان کے لب و لہجہ میں آہنگ کا بھی ہے ۔ اس بات کو ہم ایک مثال سے واضع کرنے کی سعی کرتے ہیں ۔ موسیقی میں گانے کی تشکیل میں بنیادی طور پر ۔ سازوں کے علاوہ دو طرح کے سر استعمال ہوتے ہیں جن کا انتخاب موسیقار گیت یا غزل کی بحر اور لفظیات کے حوالے سے کرتا ہے ۔ ان موسیقاروں نے ایک سُر کا نام کومل سر رکھا ہے ۔ جبکہ دوسرے سر کو یہ تیور سر کہتے ہیں ۔ کومل سروں کا آہنگ مدھم اور قدرے ملائمت پسند ہوتا ہے ۔ زبان میں نرمی اور لہجہ میں دھیما پن

میں استعمال مستزاد ہے جس نے اس بیان کو تمثال کاری کا اعلیٰ نمونہ بنا دیا ہے ۔

"جب کبھی سویرے سویرے ہواؤں پر بادلوں کا بار دانہ بنجاروں کے ڈیروں کی طرح لاد کر آسمانوں سے بوندیاں برساتا گزرتا یا جھنجھلاتی ہوئی تیز ہوا بادلوں کی میلی روئی کو بجلی کی سنہری دھنکی سے پننے لگتی تو کوٹھوں کی چارپائیوں پر چاروں طرف ہندو عورتوں کے ننگے جسم دور سے یوں معلوم ہوتے جیسے صندلی بادلوں اور تاریک دھندلکوں کے نکے کلبلا رہے ہوں ۔" [1]

ایک نثر پارہ یہ بھی دیکھیں ۔

" ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے میرے قدم زمین پر نہیں اور میں فضا میں ڈول رہا ہوں کھلاتے ہوئے کراہتے غنچے اور سرد آہیں بھرتا سبزہ مجھے متوجہ کر رہا ہے ۔ میری آنکھوں کے سفینے ریت برساتی ہوئی آندھی میں پھنسے ہوتے ہیں ۔ اور کہیں کہیں غبار میں پھنسا ہوا اجالا رحم طلب نگاہوں سے سورج کی طرف تک رہا ہے ۔ اس وقت مجھے انگیٹھیوں پر پھولوں بھرے گلدان زخموں کے گلدستے اور شبنم سے چھپتے ہوئے سبزے کے اونچے نیچے پلاٹ آنسوؤں کے کھلیان نظر آ رہے تھے ۔" [2]

---

[1] احسان دانش "جہان دانش" ص۔ 26

[2] ایضاً ص ۔

اس سر کا اختصاصی وصف ہے - جبکہ تیور سروں میں آہنگ قدرے بلند ہوتا ہے اوران کے لب و لہجہ میں شان و شوکت اور رعب و داب کی کھنک کا عنصر نمایاں ہوتا ہے - اس گفتگو کی روشنی میں "یادوں کی برات" کی زبان و بیان کے لب و لہجہ میں تیور سروں کا آہنگ موجود ہے - جبکہ "جہان دانش" کی زبان و بیان کے لب و لہجہ میں کومل سروں کا آہنگ پایا جاتا ہے - جوش کی طرح "احسان دانش" کی تحریروں میں بھی شاعرانہ وسائل کا بھر پور استعمال نظر آتا ہے - جس نے "جہان دانس" کی تحریروں میں شاعری کی ادا پیدا کر دی ہے - زندگی کی ہر تڑپ اور اس تڑپ میں تپ کر تخلیق ہونے والے مشاہدہ کو احسان دانش نے کائنات میں موجود مشابہتوں سے جا بجا واضع کیا ہے - مگر استعاروں اور علامتوں کی مدد سے مجردات اور معقولات کی یہ تجسیم عبارت سازی سے کہیں بلند ہے اور احساسات و تصورات کی تمثال کاری میں ہر کردار کی داخلی کیفیات تک ادراک نہایت لطیف تاثر پیدا کرنے لگتا ہے - "جہان دانش" کی یہ خصوصیت اس کے دلکش اور بلیغ اسلوب بیان سے متصف ہے - ہم اس حوالے سے "جہان دانش کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ" کے باب میں گفتگو کر چکے ہیں - تاہم یہاں تقابلی مطالعہ کی خاطر اہتمام حجت کرتے ہوئے دو ایک مثالیں پیش کرتے ہیں -

"جہان دانش" کے اس نثر پارہ میں برسات کی مصوری، جس کاریگری سے کی گئی ہے اس سے زیادہ موثر وہ تصویریں ہیں جو اس موسم میں انسانی حالتوں اور موقعوں سے متعلق ہیں - اس پر شاعرانہ وسائل کا غیر محسوس انداز

اس نثر پارے میں نثر کے شاعر نے معقولات اور مجردات کی جسطرح مصوری کی ہے وہ انہیں انسان کی سطح پر لے آتی ہے - کائنات کے خارجی ماحول میں انسان کی داخلی کیفیات کا اتصال احسان دانش کی فنکارانہ مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہے - جہاں دانش کا یہ ادبی حوالہ اپنے اندر کسی ناول نگار کے لیے خصوصی اکتساب کے کئی پہلو رکھتا ہے -

" جہان دانش " کا ایک حوالہ اسے متقابل آپ بیتیوں پر خصوصی فوقیت دیتا ہے اور وہ اس کی حکیمانہ تحریریں ہیں - حکایات لقمان کی طرح اس کتاب میں بھی اپنے قارئین کے لیے ایسے ایسے نادر نکات دانش موجود ہیں کہ وہ ان عبارتوں اور تحریروں سے زندگی میں حسن و خوبی اور تمرد و تحریک کے اسالیب سے باہم زندگی کو سمجھنے کے قابل ہو جاتا ہے اور اس کا شعور اور آگہی اس اس کے وجدان کو گدرانے میں کچی عمر سے ہی معاون ہو جاتے ہیں - لیکن بجائے خود احسان دانش کو اس کے لیے بڑے جانگسل حالات سے گزرنا پڑا ہے - مثال کے طور پر ہم یہاں دو ایک نکات درج کرتے ہیں -

1 - "کسی کی بھی جوانی دوسروں کے تجربوں پر کب اعتبار کرتی ہے"-

2 - "استاد کا فن تعلیم سے زیادہ تقویتی ہے -"

3 - " درخت اپنے سائے کی تقسیم میں دوست دشمن کا امتیاز نہیں کرتے "

اپنی گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے یہاں ہم ایک بات دہرانا ضروری خیال کرتے ہیں کہ " جہان دانش " ایک مہذب انسان کی تخلیق ہے - جس کا اسلوب اپنے خالق کا اتباع کرتا ہوا نظر آتا ہے - احسان دانش نے اپنی نا آسودگیوں پر شکایت نہیں کی اور وہ اپنی آزادی کیلئے اوروں کو غلام نہیں بناتے ـــــ یہ

دونوں باتیں بالترتیب احسان دانش کی ادبی اور خانگی زندگی پر صادق آتی ہیں "جہان دانش" کا یہ پہلو "یادوں کی برات" سے لگا نہیں کھلتا البتہ "مٹی کا دیا" کی تحریریں جہان دانش" کے ان اسالیب کے قریب نظر آتی ہیں

زبان و بیان کے حوالے سے "مٹی کا دیا" کا اسلوب خالصتاً پنجاب (پاکستان) کی اردو زبان وبیان کے لب ولہجہ سے ترتیب پایا ہے - اس کتاب کی تحریریں اسی سر زمین کی تہذیبی روایات میں رچی بسی ہوئی ہیں میرزا ادیب نے اندرون لاہور بالخصوص بھاٹی دروازہ اور اس کے گرد و نواح کی بود و باش زبان و بیان اور مناظر کو بہت خوبی سے بیان کیا ہے -یہاں پر ان کے لہجہ میں تاثر کی وہ توانائی موجود ہے جو واقعات کی زمینی تقسیم اور ان کے اثرات کو زمانی حلقے میں پرونے کی صلاحیت رکھتی ہے -"جہان دانش" کی تحریروں کے بعد یہ خوبی "مٹی کا دیا" میں موجود ہے - اس کتاب میں مصنف کے لب و لہجہ میں رومانی اسلوب کا آہنگ بالترتیب گہرا ہوتا ہوا نظر آتا ہے- لیکن یہ رومانی اسلوب اپنے روائتی تاثر سے بالکل مختلف ہے اس اسلوب میں ایک نامیاتی وحدت کا عنصر موجود ہے - جس نے بیان (اسلوب)اور واقعہ کو اس طرح باہم رکھا ہوا ہے کہ زبان وبیان کا انتخاب واقعہ کے انتخاب سے متعلق ہو کر رہ گیا ہے میرزا ادیب نے بھی اپنی تحریروں میں شاعرانہ وسائل کی آنچ سے جذبات کے تاثر کو دو چند کیا ہے - لیکن ان تحریروں میں صنائع بدائع کا استعمال "جہان دانش" اور "یادوں کی برات" کے مقابلے میں بہت کم ہے -

البتہ شاعرانہ وسائل کا استعمال " جہان دانش " کی طرح اپنے اندر بھرپور تہذیبی رچاو رکھتا ہے - جس کا لہجہ عاجزی اور انکساری میں گندھا ہوا ہے۔

میرزا ادیب نے اپنے جذبات اور احساسات کی عکاسی کے لیے مظاہر سے مشابہتیں تلاش کی ہیں یہ مشابہتیں اپنے مثل سے اس قدر مماثل ہیں کہ ان تحریروں میں خاکہ نگاری کا رچاو پیدا ہوگیا ہے - میرزا ادیب کے حافظے میں قید زندگی متحرک تصویروں کی طرح چلنے پھرنے لگتی ہے - ہم معاصر آپ بیتیوں میں "جہان دانش" کا مقام کے باب میں "مٹی کا دیا" پر گفتگو مکمل کر چکے ہیں۔ تاہم تقابل کے نقطہ نظر سے چند ایک مثالیں پیش خدمت ہیں -

میرزا ادیب اپنے والد صاحب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں -

" دنیا میں بعض ایسی جھیلیں بھی ہیں جن کا پانی بیک وقت شیریں بھی ہے اور کھارا بھی ! ان کے ایک حصہ میں جو پانی بہتا ہے وہ میٹھا ہوتا ہے اور دوسرے حصے کا کڑوا ، کسیلا یا سخت نمکین ، قدرت کا معجزانہ کمال یہ ہے کہ ان میں پانی کی دونوں سطحیں الگ الگ رہتی ہیں اس طرح ہر حصے کے پانی کا اپنا ذائقہ برقرار رہتا ہے - میں جب بھی اپنے ابا جان کا خیال کرتا ہوں تو میرے ذہن میں اسی قسم کی ایک جھیل کا تصور جاگ اٹھتا ہے --" [1]

میرزا ادیب نے جوش اور احسان دانش کی طرح منظر نگاری اور کردار نگاری میں تمثال کاری سے کام نہیں لیا بلکہ اپنی تحریروں میں تجسس کے عنصر سے دلچسپی

---

[1] میرزا ادیب - " مٹی کا دیا " ص - 299

پیدا کی ہے ۔ البتہ آپ بیتی کا نام "مٹی کا دیا" پوری طرح علامتی پس منظر کا حامل ہے ۔ ان کی تحریروں میں سادگی و پرکاری کا عنصر بہت نمایاں ہے ۔ وہ عبارت پر جوش کی طرح محنت نہیں کرتے اور نہ ہی لفظوں کے مترادفات سے اپنے بیان کو بوجھل اور شاعرانہ بناتے ہیں ۔ ان کے ہاں سحر انگیزی بھی آتی ہے ۔ تو اس کے معنیاتی سیاق و سباق کسی ابہام میں گم نہیں ہوتے ۔ انہوں نے اپنے احساس کو اجتماعی طرز احساس میں بدل دیا ہے اور میرزا ادیب کے ناساز گار حالات اور ناخوشگوار واقعات ایک فرد کی بجائے ایک نسل کا المیہ لگنے لگتے ہیں لیکن ان کی کہانی مبالغہ سے آلودہ نہیں ہونے پاتی ۔

موروثی افلاس کے ہاتھوں تنگ آ کر کم عمری میں بڑھئی کے پیشہ سے وابستہ ہونے کا واقعہ لکھتے ہوئے ایک جگہ وہ کہتے ہیں ۔

" دادی اماں نے اپنی اس شاگردہ کے ذریعہ سلطان کو گھر پر بلایا اور مجھے اس کے سپرد کرتے ہوئے کہا پتر اسے اپنے جیسا استاد بنا دے ۔ اپنے سے بڑا استاد بناؤں گا اماں ! سلطان نے یقین دلایا ---- پہلے روز دادی اماں پر احسان کرتے ہوئے سلطان خود گھر پہنچا اور مجھے ساتھ لے گیا ۔ کھوکھے کے اندر قدم رکھتے ہی میرے دماغ میں ایک ایسی بدبو گھس گئی کہ میں بری طرح پریشان ہو گیا چاہا کہ فوراً بھاگ جاؤں مگر سلطان نے مجھے زمین پر بیٹھنے کا اشارہ کر دیا ۔ میں بیٹھ گیا ہم اسے استاد کہتے تھے ۔ استاد کا پہلا حکم یہ تھا کہ حقہ تازہ کر کے لاؤ میں نے اپنے گھر میں ابا جی کو حقہ تازہ کرتے ہوئے

دیکھا ضرور تھا مگر خود یہ کام کبھی نہیں کیا تھا - سخت پریشان ہو گیا - کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ استاد کے دو شاگرد آ گئیے ---- - یہ استاد عجیب آدمی تھا وہ ہر شاگرد کو ------ عام طور پر اولونڈے کہہ کر بلاتا تھا - اس نے کام سکھانے سے پہلے حقہ تازہ کرنے ، آگ جلانے اور چلم بھرنے کا فن سکھایا - کہا کرتا تھا اولونڈے ! حقہ تازہ نہیں کرو گے تو کام کیسے سیکھو گے ---- چھٹے روز استاد نے مجھے رندے سے لکڑی صاف کرنے کا سبق دیا ، اے لونڈے ! اب خود کام کر میں نے رندہ لکڑی پر پھیرا وہ لکڑی کے آخر میں پہنچ کر رک نہ سکا ----- آگے خلا تھا میں اس کے ساتھ آگے جو بڑھا تو سامنے دیوار سے جا ٹکرایا ------ استاد اور اس کے دونوں شاگرد زور زور سے ہنس رہے تھے اور ان کے بھدے قہقہوں کی آواز شیشے کی طرح میرے کانوں پر ضربیں لگا رہی تھی -" [1]

اب تک کی گفتگو کا جائزہ لیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ " یادوں کی برات " اور "جہان دانش " کے اسالیب میں شاعرانہ وسائل کے استعمال کی حد تک مماثلت پائی جاتی ہے - جبکہ " مٹی کا دیا " میں شاعرانہ وسائل کا استعمال قدرے کم نظر آتا ہے - جوش اور احسان دانش بنیادی طور پر شاعر تھے - اور میرزا ادیب نثر نگار ـــ احسان دانش اور میرزا ادیب معاشی طور پر قدرے بد حالی کا شکار گھرانوں میں پیدا ہوئے جنہیں علم و ادب سے واجبی سی وابستگی تھی - لیکن جوش کے ہاں علم اور دولت کی فراوانی تھی اور جوش کو زندگی کا بہت کم عرصہ اپنی راہ متعین کرنے پر صرف

---

[1] میرزا ادیب - " مٹی کا دیا " ص - 27 - 28

دیکھا ضرور تھا مگر خود یہ کام کبھی نہیں کیا تھا - سخت پریشان ہو گیا - کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ استاد کے دو شاگرد آ گئے - - - - - یہ استاد عجیب آدمی تھا وہ ہر شاگرد کو - - - - - - عام طور پر اولونڈے کہہ کر بلاتا تھا - اس نے کام سکھانے سے پہلے حقہ تازہ کرنے ، آگ جلانے اور چلم بھرنے کا فن سکھایا - کہا کرتا تھا اولونڈے ! حقہ تازہ نہیں کرو گے تو کام کیسے سیکھو گے - - - - چھٹے روز استاد نے مجھے رندے سے لکڑی صاف کرنے کا سبق دیا ، اے لونڈے ! اب خود کام کر میں نے رندہ لکڑی پر پھیرا وہ لکڑی کے آخر میں پہنچ کر رک نہ سکا ——— آگے خلا تھا میں اس کے ساتھ آگے جو بڑھا تو سامنے دیوار سے جا ٹکرایا - - - - - - استاد اور اس کے دونوں شاگرد زور زور سے ہنس رہے تھے اور ان کے بھدے قہقہوں کی آواز شیشے کی طرح میرے کانوں پر ضربیں لگا رہی تھی - "[1]

اب تک کی گفتگو کا جائزہ لیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ "یادوں کی برات" اور "جہان دانش" کے اسالیب میں شاعرانہ وسائل کے استعمال کی حد تک مماثلت پائی جاتی ہے - جبکہ "مٹی کا دیا" میں شاعرانہ وسائل کا استعمال قدرے کم نظر آتا ہے - جوش اور احسان دانش بنیادی طور پر شاعر تھے - اور میرزا ادیب نثر نگار ——— احسان دانش اور میرزا ادیب معاشی طور پر قدرے بد حالی کا شکار گھرانوں میں پیدا ہوئے جنہیں علم و ادب سے واجبی سی وابستگی تھی - لیکن جوش کے ہاں علم اور دولت کی فراوانی تھی اور جوش کو زندگی کا بہت کم عرصہ اپنی راہ متعین کرنے پر صرف

---

[1] میرزا ادیب - "مٹی کا دیا" ص - 27 - 28

کرنا پڑا جبکہ احسان دانش کو بالخصوص اور میرزا ادیب کو بالعموم زندگی کی راہ کا تعین کرنے کیلئے طویل عرصہ تک جدوجہد کرنی پڑی - جوش، احسان دانش اور میرزا ادیب کے بنیادی میلانات میں اگرچہ مماثلت زیادہ اور فرق کم ہے - مگر ان کے اسالیب اور تخلیقات کے مقاصد مختلف ہیں - زبان و بیان کے حوالے سے جوش کا لب و لہجہ گنجلک اور پر پیچ ہے - ان کے اسلوب میں شان و شوکت اور بوجھل الفاظ کا آہنگ غالب ہے - جبکہ احسان دانش کے ہاں متنوع لفظیات کا لب لہجہ مدھم اور کومل ہے اور ان کے بیان میں شیختگی اور گداختگی کا آہنگ نمایاں ہے - اور میرزا ادیب کی تحریروں میں سادہ بیانی اپنے پرکارانہ رنگ میں جھلکتی ہے - اور ان کا تخیل انکسار کے تابع ہے - ان کی تحریروں میں آپ بیتی کے علاوہ دیگر اصناف ادب مثلاً افسانہ اور ڈراما وغیرہ کا تاثر بھی ملتا ہے -

موضوعاتی اعتبار سے دیکھیں تو "یادوں کی برات" پانچ بنیادی حصوں میں منقسم ہے - جو چوراسی (84) ضمنی موضوعات پر پھیلے ہوئے ہیں - ان کے علاوہ اس کتاب میں جوش کے 8 اعداد معاشقوں کا ذکر بھی شامل ہے - جبکہ فکری نقطہ نظر سے "یادوں کی برات" میں جوش ملیح آبادی کے چار بنیادی حوالے ملتے ہیں - نمبر 1، عشق بازی - نمبر 2، علم طلبی - نمبر 3 - شعر گوئی - نمبر 4 - انسان دوستی -

"معاصر آپ بیتیوں میں "جہان دانش" کا مقام" کے باب میں ہم "یادوں کی برات" پر تنقیدی گفتگو کر چکے ہیں - یہاں ہم صرف اپنی ضرورت کے حوالے سے کچھ باتوں کو چند نئے اضافوں کے ساتھ دھرائیں گے - تاکہ اس باب کا

مقصد پورا ہو سکے ۔ اس بات میں شک کی گنجائش ذرا کم ہے کہ " یادوں کی برات" جوش کی اعلیٰ علمی استعداد اور بہترین فنی مہارت کی دستاویز ہے ۔ " یادوں کی برات " میں ہمیں صرف جوش کے متعلق ہی قطعیت کے ساتھ ان کا بیان نہیں ملتا بلکہ اس کتاب میں جوش نے اپنی نفسیات پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ احباب کی نفسیات کو بھی سمجھنے میں ہماری مدد کی ہے ۔ جوش کے گرد و پیش کے حالات و واقعات ، معاشرتی اور سماجی رحجانات ، تہذیبی اور سیاسی صورت حال کا فنکارانہ بیان بھی اس کتاب کا ادبی سرمایہ ہے ۔" یادوں کی برات " کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ جوش کے ہاں شروع دن سے ہی علم اور دولت کی فراوانی تھی ۔ اور جوش دن بھر حصول علم کی تگ و تاز میں سرگرداں رہے ۔ انہیں علم سے جنون کی حد تک محبت تھی ۔ یہ ہی وجہ ہے کہ کم سنی ہی میں جوش کے بنیادی میلانات واضع ہونے لگے ۔ " یادوں کی برات " کے مطالعہ سے ہمیں جسقدر کم عمری میں جوش کی خود آگاہی اور اپنی ذات سے شناسائی کے آثار ملتے ہیں ۔ اردو ادب میں اس حوالے سے بہت کم ہستیاں بالغ النظر ہوتی ہوئی نظر آتی ہیں ۔ اس باب کے مطالعہ میں علم سے جوش کی محبت ہمہ پہلو لگتی ہے ۔

جوش کی شعر گوئی چونکہ براہ راست ہمارے مطالعہ کا حصہ نہیں اس لیے ہم جوش کی شاعری سے صرف نظر کرتے ہیں ۔ تاہم جوش کے اس حوالے کو ہم جوش کی علم طلبی میں ضم کرتے ہوئے اتنا ضرور عرض کریں گے کہ جوش ملیح آبادی کی نثر شاعرانہ وسائل کی آنچ سے دو چند ہوئی ہے ۔ جو " یادوں کی برات " کا اسلوب ہے ۔ اس کا دوسرا اور چوتھا بڑا حوالہ " عشق بازی " اور انسان دوستی "

ہے - عشق بازی کے باب میں جوش کے معاشقے انکی فکر اور تعلیمات کے نمائندہ ہیں - ان معاشقوں سے متعلق تحریروں کے مطالعے سے محسوس ہوتا ہے کہ ان کی ذات کے جبلی گوشے ان کی عقل اور شعوری پہلووں پر حاشیہ گیر ہیں - ان کی فکری تعلیمات نے عملی طور پر جوش کی زندگی پر ذرا کم اثر کیا ہے -

عشق بازی میں وہ ہر خوبصورت چہرے پر حق تصرف جمانے کے خواہش مند ہیں اور بقدر استطاعت زندگی بھر اس کا مظاہرہ بھی کرتے رہے ہیں - - مگر وہ حسن کو حقیقی داد دینے میں ہمیشہ ناکام و نامراد رہے ہیں - ان کی عشق بازی نے جذبہ محبت کے خدوخال کو پامال کر رکھا ہے - وہ عمر بھر عورت کے ریشم میں کٹھے رہنے کی آرزو میں سرگرم رہے . مگر من کے فولاد کو پگھلا کر اپنی عشق بازی کو کوئی خام نازکی عطا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے - اور ان کی عشق بازی گناہ بے لذت بن کر رہ گئی -

انسان دوستی میں انفرادی عدل اور اجتماعی مساوات کے حوالے سے جوش ترقی پسند تحریک سے وابستہ اکثر ادیبوں کی طرح متضاد زندگی کی مثال بنے رہے جس نے "یادوں کی برات" کو متنازعہ بنانے میں اہم کردار ادا کیا - ستاروں کی تخلیق اور گردش دوراں کے متعلق تہہ دار سوالات کرنے والا جوش توہمات اور بے زمین روایات کے حلقے میں سالہا سال سے ٹھہرے ہوئے معاشرے میں کوئی حرکی مثال قائم کرنے میں کامیاب نظر نہیں آتا - وہ غربت اور افلاس کے جمع غفیر میں گھرے ہوئے مجبور انسانوں کے لیے مارکسی فکر کو معجزاتی طور پر نجات دہندہ سمجھتے ہیں مگر اپنی زندگی میں حصول زر اور آسائش و آرام کے لیے تڑپ تڑپ جاتے

ہیں ۔ معاشی عدم استحکام کے شکار معاشرے کے لیے ان کے پاس صرف انقلاب روس کی برکات ہی ہیں ۔

مجموعی طور پر یہ کتاب شاعرانہ وسائل کے استعمال کا بہترین نمونہ ہے اور 1947ء کے بعد تخلیق ہونے والی باقاعدہ آپ بیتیوں میں ایک اہم آپ بیتی بھی ، یہ کتاب اپنے عہد کی تاریخ بھی ہے اور جوش کی زندگی کی داستان بھی ۔ اس تاریخی داستان کی ادبی فضا خالصتاً لکھنوی تہذیب و تمدن سے معمور ہے اور پاکستان سے جوش کا لگاو واجبی سا محسوس ہوتا ہے ۔ یہاں جوش ذاتی نا آسودہ خواہشات اور اغراض کے شدید دباو کا شکار لگتے ہیں ۔ اس حوالے سے ان کے لب و لہجہ میں تعصب کو صاف محسوس کیا جا سکتا ہے ۔ اور جوش مشرقی اقدار سے شعوری طور پر متحارب نظر آنے لگتے ہیں ۔ محترم اور غیر متنازعہ شخصیات پر ان کے اعتراضات ان کے خود ساختہ زیادہ اور تاریخی حقائق پر کم مبنی لگتے ہیں۔

جوش اس کتاب کے حوالے سے کوئی واضع نظریہ حیات پیش کرنے سے قاصر رہے ہیں ۔ موضوعات میں تخلیق پاکستان کے حوالے سے خاموشی "یادوں کی برات" پر سوال بن گئی ہے ۔ جس کا جواب ہمیں جوش کی زندگی سے کہیں نہیں ملتا ۔

دوسری طرف "جہان دانش" پہلی مرتبہ 1975ء میں تین بنیادی حصوں میں منقسم 192 ضمنی موضوعات کے تحت 645 صفحات پر مشتمل منظر عام پر آئی۔ فکری نقطہ نظر سے احسان دانش اور جوش ملیح آبادی کے بنیادی فکری میلانات میں مماثلت پائی جاتی ہے ۔ علم سے احسان دانش کی محبت لا محدود ہے ۔ اگرچہ اس

علم کی گنبد کے ذرائع مختلف ہیں - لیکن "جہان دانش" اور "یادوں کی برات" اپنے مصنفین کی علمی وادبی شخصیات کی بھرپور نمائندگی کرتی ہیں - اس سلسلے میں احسان دانش کو جوش ملیح آبادی پر ایک حوالے سے فوقیت حاصل ہے اور وہ یہ کہ انہوں نے اپنے تجربات سے اپنے موضوعات کو ہمیشہ کے لیے زندہ کر دیا ہے - انہوں نے نہ صرف اپنی زندگی کے تلخ اور جانگسل واقعات کو اپنے شیریں لب و لہجے کی مدد سے قارئین کے لیے مفید بنا دیا ہے بلکہ آپ بیتی کی صنف میں اسلوب بیان کی ایسی طرح ڈالی ہے کہ انفرادی واردات میں اجتماعی تجربے کا حسن پیدا ہو گیا ہے - اور گزری ہوئی صداقتیں عصر حاضر کے بالا بر میں اس طرح رفو ہوئی ہیں کہ کوئی سیون دکھائی نہیں دیتی - حکمت اور دانائی نے اس کتاب کو گزشتہ پچاس برس کی علمی و ثقافتی تاریخ بنا دیا ہے - اور یہ کتاب روشنائی سے نہیں روشنی سے لکھی ہوئی محسوس ہوتی ہے - احسان دانش نے اپنی یہ کتاب محض اپنی آپ بیتی لکھنے کی غرض سے ہی نہیں لکھی بلکہ یہ یاد داشتیں ان دھندلے دھندلے نقوش کے تحریری حوالے ہیں جو اس خیال سے پیش کئے گئے ہیں کہ

"یہ کسی رخ سے انسانیت کے لیے مفید ہوں -" سہ[1]

موضوعاتی حوالے سے "جہان دانش" وطن سے لے کر قائد ملت کی شہادت تک 192 چھوٹے بڑے موضوعات پر پھیلی ہوئی ہے - یہ کتاب احسان دانش کی مکمل

سہ[1] احسان دانش - "جہان دانش" ص - 13

آپ بیتی نہیں ہے کیونکہ اس کتاب کی دوسری جلد تا حال منظر عام پر نہیں آئی جس کا ذکر احسان دانش نے "دیباچۂ حیات" میں کیا ہے - تاہم بچپن سے جوانی اور جوانی سے بزرگی تک کے چنیدہ مگر غیر منظم واقعات کی یاد داشتیں اس کتاب کا سرمایہ ہیں جو احسان دانش کے عہد کا کبھی ہیولہ لگتی ہیں اور کبھی ایک مکمل تصویر۔ اس پر واقعات کا سچا پن مستزاد ہے -

موضوعاتی حوالے سے اس کتاب کا "یادوں کی برات" کے مقابل ایک اختصاصی امتیاز یہ بھی ہے کہ "جہان دانش" میں تقسیم ہند اور تخلیق پاکستان کے واقعات کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے - ان تحریروں میں جہاں قیام پاکستان کے وقت جنم لینے والے فسادات اور قتل و غارتگری کا ذکر ملتا ہے - وہاں انسانی نفسیات کے کئی نادیدہ گوشے بھی اجاگر ہوتے ہیں - ان تحریروں میں 1947ء کے بعد تخلیق ہونے والے ادب میں پائی جانے والی تنہائی اور خوف سے مرتب کیفیات کے تخلیقی سوتے بھی موجود ہیں -

علم کے بعد محبت جوش کی طرح احسان دانش کے اعلیٰ آدرشوں میں شامل ہے - لیکن احسان دانش کے ہاں محبت اپنے پورے مشرقی اور تہذیبی رکھ رکھاؤ کے ساتھ جلوہ گر ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ محبت بذات خود کوئی کردار ہے - جس کا اتباع محبت کے جذبہ کو متشکل کرنے کے لیے کوئی عملی صورت ہے -

احسان دانش نے خود غرض اور ہوس پرست معاشرے میں قید محبت (شمعی) کو اپنی جذبے کی سچی رفاقت سے آزاد فضا میں کھلا چھوڑ دیا ہے -

اور طوائف کے گھر کی لڑکی (شمعی) ایک بلند کردار محبوب کا روپ دھار کر جوش کی عشق بازی " کا منہ چڑھانے لگتی ہے - اپنے وسیع تر تناظر میں یہ محبت اپنے اندر انسان دوستی کے تمام مفاہیم رکھتی ہے - احسان دانش نسلی امتیازات کی بنیاد پر استوار زندگی میں تبدیلی کے لیے اشتراکیت کی بجائے حقیقی انسانی مساوات کے خواہاں نظر آتے ہیں - "جہان دانش" کے اوراق میں بندہ مزدور کے اوقات کی تلخی جس قدر سچی اور حقیقی لگتی ہے - جوش ملیح آبادی کے ہاں اس کا شدید فقدان نظر آتا ہے - احسان دانش چونکہ خود مزدور تھے لہذا ان کی تحریروں میں مزدور کی جملہ نفسیات کا ابھر آنا فطری ہے - اس اظہار میں احسان دانش کے اسلوب اور فنی مہارت کا دخل لب و لہجے میں تاثر کا الگ جہان روشن کئے ہوئے ہے - ان تحریروں میں شعری وسائل نے بیان کے تاثر کو جس طرح دوچند کیا ہے اس نے ان کی شعری حیثیت بھی متعین کر دی ہے - یہاں چونکہ ہمیں ان کی شعری حیثیت سے بحث مطلوب نہیں ہم ان کی شعری حیثیت کو ان کی زبان و بیان اور علم دوستی کے زمرہ میں رکھتے ہوئے یہ کہہ سکتے ہیں کہ احسان دانش نے اپنی باولی کو تجربے اور مشاہدے کے نور سے بھر رکھا ہے - اور اس باولی سے ابھرنے والی ہر واردات کو روشنائی کی جگہ روشنی سے تحریر کیا ہے - جس نے "جہان دانش" کو آپ بیتی میں نمایاں مقام عطا کر دیا ہے -

اس کے برعکس " مٹی کا دیا " 1981ء میں 727 صفحات پر مشتمل اور دو بنیادی حصوں میں منقسم منظر عام پر آئی اس کتاب کا پہلا حصہ باب اول سے باب

چونتیس تک پھیلا ہوا ہے - جس میں بچپن جوانی اور بڑھاپے کے حالات و واقعات کو بالترتیب رقم کیا گیا ہے - اس کے علاوہ " مٹی کا دیا " کا علامتی ذکر بھی ان ابواب کی گفتگو میں شامل ہے جسے انہوں نے اپنے بچپن ہی سے جلتے ہوئے دیکھا ہے -

دوسرا حصہ اٹھائیس ابواب پر مشتمل ہے - جن میں سترہ ابواب میں " میرے ہمدم میرے دوست " کے عنوان سے میرزا ادیب نے اپنے احباب کا ذکر کیا ہے - ایک باب " میرے مکرم میرے دوست " کے نام سے موجود ہے - جس میں وہ اپنے بے تکلف دوستوں اور احباب کا ذکر کرتے ہیں - اس کے علاوہ ایک باب میں بمبئی میں اپنے نشیب و فراز کو قلمبند کیا ہے اور تصانیف کے تذکرے سے پہلے اپنے ایک گمنام محسن کا ذکر کیا ہے - کتاب کے اختتام پر اختتامیہ نظم موجود ہے اسکے علاوہ پرانے لاہور کے گلی کوچوں کا ذکر اور اپنے افسانے کے ان کرداروں کا ذکر جو میرزا ادیب کے لاشعور میں پرورش پاتے رہے ہیں بھی اس کتاب کے خصوصی مطالعے میں شامل ہے -

گفتگو کے اس حصے میں انہوں نے ترقی پسند تحریک سے اپنے اصولی اختلاف اور اتفاق سے بھی قارئین کو آگاہ کیا ہے - " میرے ہمدم میرے دوست " اور " میرے مکرم میرے دوست " کی تحریروں میں میرزا ادیب نے جذبات نگاری اور کردار نگاری میں اپنے ذاتی احساس کے ساتھ اپنی ڈراما نگاری اور افسانہ نویسی کی صلاحیتوں سے بھی کام لیا ہے - جس سے تحریر کی تاثیر دو چند ہو گئی ہے - تحریر میں اس حسن کو اجاگر کرنے کے لیے احسان دانش نے محاکات اور تمثال کاری

کا سہارا لیا ہے جبکہ جوش نے شعری وسائل کو وسیلہ بنایا ہے ۔

" مٹی کا دیا " کے پہلے حصے کی بعض تحریریں خاکہ نگاری کے قریب تر نظر آتی ہیں ۔ میرزا نے زندگی کے میلے میں ملنے والے پیارے ساتھیوں، دوستوں اساتذہ ، بیوی بچوں اور والدین کو اپنی ذات پر تقدم بخشا ہے ۔ ان کی تحریر کا مجموعی تاثر عاجزی اور انکساری کے خمیر میں گندھا ہوا ہے ۔ جبکہ جوش کے ہاں اس لب و لہجے کا فقدان پایا جاتا ہے ۔

میرزا ادیب جوش اور احسان دانش کی طرح مسلم شعری حیثیت کے مالک نہیں تھے ان کی ادبی حیثیت بطور افسانہ نگار ، ڈراما نویس فیچر رائٹر اور کالمسٹ کی ہے یہ ہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں ڈرامے اور افسانے کے عناصر تجسس کے حوالے سے دلچسپی پیدا کرتے ہیں ان کا المیہ ایک فرد کی بجائے پوری نسل کا المیہ محسوس ہوتا ہے ۔ انہوں نے نہ تو اپنے جوش بیان سے ۔ جوش ملیح آبادی کی طرح اپنے گرد ایک سنہری ہالہ بنا ہے ۔ نہ ہی اپنی عاجزی کو مظلومیت کے سانچے میں ڈھالا ہے ۔ انہوں نے بھی احسان دانش کی طرح اپنی زندگی کی کہانی کو مبالغے سے آلودہ نہیں ہونے دیا ۔ اور رومانی واقعات کو بھی سادہ سے واقعات میں بیان کر دیا ۔

" کچھ سیاسی مناظر " کے عنوان کے تحت میرزا ادیب نے اپنے سیاسی شعور کا اظہار بھی کر دیا ہے ۔ اس باب میں انہوں نے تحریک موالات ، جلیانوالہ باغ ، تحریک خلافت ، تحریک نیلی پوش، شدھی کی تحریک ، اہنسا کی تحریک

کانگرس ، اور مسلم لیگ کے ساتھ ساتھ قیام پاکستان کے واقعات پر اپنا اظہار خیال کیا ہے ۔ اس کے علاوہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان بعد و تفاوت ، تہذیبی اشتراک سماجی اقدار ، قومی تہوار ، لاہور کے دنگل اور کشتیوں کا ذکر بھی اس کتاب کا حصہ ہے ۔

اب تک کی گفتگو کا جائزہ لیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ " جہان دانش " " یادوں کی برات " اور " مٹی کا دیا " اردو زبان میں لکھی جانے والی آپ بیتیوں میں بہت حد تک صنف "آپ بیتی" کی تعریف پر پوری اترتی ہیں ۔ "جہان دانش " اور " یادوں کی برات " میں کئی حوالوں سے مماثلت کے باوجود امتیازات پائے جاتے ہیں ۔ احسان دانش اور جوش ملیح آبادی کی مسلم شعری حیثیتیں ان کی آپ بیتیوں سے عیاں ہیں مگر موضوعاتی حوالے سے " جہان دانش " کا محیط " یادوں کی برات " کے مقابلے میں زیادہ وسیع تر ہے ۔ احسان دانش کے مہذب جینئس نے ان کے حالات و واقعات کو بناوٹ اور تصنع سے آلودہ نہیں ہونے دیا ۔ جہان دانش کی تحریریں اپنے سچے پن کی مظہر ہیں ۔ جوش ملیح آبادی کے ہاں واقعات کے بیان میں عبارت پر محنت اور بناوٹ کا احساس ہوتا ہے ۔ جوش نثر لکھتے ہوئے شاعری کے تجربے کرنے لگتے ہیں ۔ " مٹی کا دیا " کی تحریریں ڈراما ، افسانہ ، فیچر ، اور آپ بیتی (اضاف نثر) کا ملا جلا تاثر دیتی ہیں ۔ میرزا ادیب بنیادی طور پر ڈراما نگار اور افسانہ نویس فیچر رائٹر اور کالم نگاری کے تجربوں سے مالا مال ہیں ۔ ان کی آپ بیتی میں ان کی یہ ادبی حیثیتیں

صاف دیکھی جا سکتی ہیں - موضوعاتی حوالے سے "مٹی کا دیا"
"جہان دانش" کی طرح " یادوں کی برات " کے مقابلے میں اپنے اندر
زیادہ پھیلاو رکھتا ہے - لیکن " جہان دانش " کے لب ولہجے کا حسن
" مٹی کا دیا " کی تحریروں میں نظر نہیں آتا -

کتابیات

1 - آل احمد سرور - "خواب باقی ہیں" لاہور فکشن ہاوس 1994

2 - احسان دانش - "جہان دانش" لاہور القائم آرٹ پریس 1975

3 - احسان دانش - "طبقات" لاہور مکتبہ دانش 1952

4 - احسان دانش - "روشنیاں" (مقالات) لاہور مکتبہ دانش 1942

5 - احسان دانش - "تذکیر و تانیث" لاہور مرکزی بورڈ 1970

6 - احسان دانش - "اردو مترادفات" لاہور مرکزی اردو بورڈ 1970

7 - احسان دانش - "دستور اردو"، "اصول فصاحت" لاہور مکتبہ دانش 1951

8 - الطاف فاطمہ - "اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقاء"
کراچی اردو اکیڈمی بار اول 1961

9 - انور سدید - ڈاکٹر - "اردو ادب کی مختصر تاریخ اسلام آباد"
مقتدرہ قومی زبان 1991

10 - بشیر سیفی - ڈاکٹر - "تنقیدی مطالعے" لاہور نذیر سنز پبلیشرز 1996

11 - جمیل احمد عدیل - "سیاق و سباق" لاہور عمیر پبلیشرز بار اول 1995

12 - جوش ملیح آبادی - "یادوں کی برات" لاہور مکتبہ شعر و ادب مئی 1975

13 - حسرت موہانی - "قید فرنگ" کراچی مکتبہ نیا راہی بار اول اگست 1972

14 - خلیق انجم - "جوش ملیح آبادی تنقیدی جائزہ"
نئی دہلی انجمن ترقی اردو 1992

15- رفیع الدین ہاشمی- "اصناف ادب" لاہور سنگ میل پبلیکیشنز اشاعت سوم 1983

16- سجاد حارث- "عوامی شاعر اور ان کا فن" لاہور
مقبول اکیڈمی بار اول 1959

17- سلام سندیلوی- ڈاکٹر- "ادب کا تنقیدی مطالعہ"
لاہور میری لائبریری طبع دوم 1964

18- سلیم اختر- ڈاکٹر- "اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ"
گیارہواں ایڈیشن جنوری 1986

19- شاہ علی- سید- ڈاکٹر- "اردو میں سوانح نگاری" کراچی گلڈ پبلشنگ ہاوس
جولائی 1961

20- ظہیرالدین بابر- "تزک بابری" مترجم رشید اختر ندوی -
لاہور سنگ میل پبلیکیشنز 1985

21- عبداللہ- سید- ڈاکٹر- "وجہی سے عبدالحق تک"
لاہور مکتبہ خیابان ادب 39، چیمبرلین روڈ لاہور
طبع دوم 1977

22- عبدالماجد- دریاآبادی- "ایک گندی کتاب" 1973

23- عبدالمجید- سالک- "سرگذشت" لاہور قومی کتب خانہ بار اول 1955

24- عقیل احمد- ڈاکٹر- "جوش کی شاعری کا تنقیدی تجزیہ" نئی دہلی
موڈرن پبلشنگ ہاوس 1993

25- قمر رئیس - "جوش ملیح آبادی خصوصی مطالعہ"
دہلی جوش انٹرنیشنل سیمینار کمیٹی 1993

26- مولانا محمد جعفر تھانیسری - "کالا پانی" لاہور سنگ میل پبلیکشنز 1972

27- میرزا ادیب - "مٹی کا دیا" لاہور مقبول اکیڈمی 1992

28- وحید اختر- ڈاکٹر - "ہماری زبان" علی گڑھ 22 جنوری 1972

*****

مقالہ جات

1- رانا محمد صفدر ادا - "اردو آپ بیتی کی تاریخ آغاز سے 1947 تک"
مقالہ برائے ایم - فل اردو - مخزونہ علامہ اقبال اوپن
یونیورسٹی لائبریری - اسلام آباد -

2- غزالہ کوثر - "احسان دانش کی نثر نگاری"
مقالہ برائے ایم - اے اردو
مخزونہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور

******

رسائل

1 - الزبیر - سہ ماہی "آپ بیتی نمبر" بہاولپور شمارہ 7 1964

2 - جام نو - "ماہنامہ" احسان دانش نمبر جلد 23 شمارہ 11 - 12
67/ زیڈ بلاک نمبر 2 پی - ای - سی - ایچ - سوسائٹی کراچی 29

3 - صدق جدید - ہفت روزہ - لکھنو 18 جون 1993

4 - قومی زبان - ماہنامہ - مئی 1982 جلد 52 - شمارہ 5 - کراچی
انجمن ترقی اردو پاکستان -

5 - نقوش - آپ بیتی نمبر - شمارہ 100 واں لاہور ادارہ فروغ اردو
جون 1964 -

*****

انسائیکلو پیڈیا

1 - اردو جامع انسائیکلو پیڈیا - جلد دوم - لاہور - شیخ غلام علی
اینڈ سنز 1988

2- The Encyclopedia Americana. Volum 2
Ankra to Azura.

*****

ALLAMA IQBAL
Open University Library
(ACQUISITION SECTION)
Acc. No. 22792
Date 12-10-99